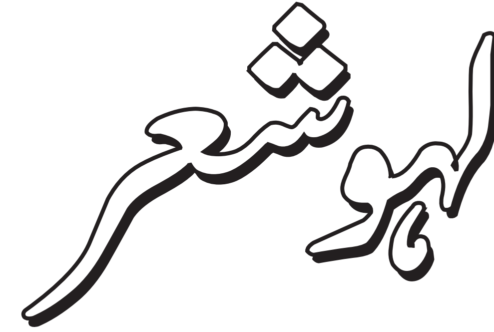


دیوانِ تسلیم نیازی

مرتب : جلال کاکوی

سن اشاعت	:	اپریل 2012
سرورق ڈیزائن	:	زریاب اسحاقی
معاون	:	کلیم آذر
طباعت	:	فائن ڈاٹ پرنٹ کریٹیو گرافک اُجالا آفسیٹ،
کمپوزنگ	:	پرویز عالم قاسمی شاہجہاں کامران (پٹوار بگان) کلکتہ ۹
تقسیم کار	:	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-4 تنویر بک ڈپو، آسنسول-1 تسلیم بک ڈپو، آسنسول-1 ادبی منچ، کلکتہ
اشاعت	:	ادبی منچ پبلیکیشنز، کلکتہ ۹
تعدادِ اشاعت	:	**500**
قیمت	:	**250 روپئے**

انتساب

دبستانِ عظیم آباد کے نام

ماہم از گلشنِ دیدار گُلے می چیدیم
ہر کجا آئینہ بینید زما یاد کنید

بیدؔل عظیم آبادی

جلال کاکوی

تسلیم نیازی

مشاہیر کی نظر میں

تسلیم نیازی کے پورے مجموعے (ڈالفن مطبوعہ 1992) کو پڑھنے پر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے منفرد لب ولہجہ کی تعمیر میں سرگرداں ہیں اور اس کے اسلوب کی انفرادیت گا ہے گا ہے اس کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ تخلیقات میں تخلیق افروزی کے محاسن ہیں اور لب ولہجہ میں جدت۔ ڈکشن کے معاملے میں اس نے جادۂ اعتدال اختیار کیا ہے لیکن علامت اور اشاریت کا غلبہ محسوس ہوتا ہے۔ ابھی اس کم سن اور نوجوان شاعر کو زندگی نے زیادہ مشق سخن کا موقع ہی کہاں فراہم کیا ہے لیکن سر دست جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اس کا تیور یہی بتا رہا ہے کہ ایک روشن ستارہ ماہتاب ضوفشاں بننے والا ہے۔

پروفیسر نادم بلخی (۳ر جنوری ۱۹۹۲)

بہت بیمار ہوں۔ مرسلہ رباعیات پر لکھ سکا تو ضرور خدمت کرونگا۔ آپ کو ترسیل واظہار پر فی الواقع قدرت حاصل ہے۔ لکھتے رہئے۔ آپ کو اردو سے محبت ہے

ڈاکٹر تارہ چرن رستوگی (۲۶ مارچ ۱۹۹۳ء)

تسلیم نیازی نوجوان شاعر ہیں۔ ابھی ان کی شاعرانہ مشق بھرپور نہیں۔ ابھی یہ کہنہ مشقوں اور دیر مشقوں کی صف میں بھی نہیں ہیں لیکن فطری شاعر ہونے کے سبب اور باصلاحیت شاعر ہونے کی وجہ سے ان کے تخلیقی عمل میں بڑی بے ساختگی ہے جو مستقبل میں انہیں قادر الکلام شاعروں کی صف میں کھڑا کردے گی۔ شارق جمال ناگپوری (۲۷ر ستمبر ۱۹۹۳ء)

تسلیم صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ مجھے آپ کے شعری مجموعے میں ایک آنچ کی کسر معلوم ہوئی۔ ذیل میں یہ باتیں برائے غور عرض کرتا ہوں۔

اب آبرو ہے اجنبی موسم کے ہاتھ میں/ اجنبی کی 'ی' ساقط۔ بغیر عصا کے سمندر گزارتا وہ شخص۔ عصا کا ع ساقط

تم ہی گزرے مرے آگے سے شرابی کی طرح
میں تو دروازے پہ تھا نام کی تختی کی طرح

شرابی (شراب) اور تختی (تخت) میں ایطا ہے

ڈاکٹر عنوان چشتی: (۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ء)

تسلیم نیازی کی اکثر وبیشتر رباعیاں بادی النظر میں پہیلیاں سی لگتی ہیں جنہیں بوجھنے کے

لئے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ایک سے زیادہ بار پڑھنے پر وہ اپنے متنوع خزینۂ خیال کے در وا کرنے لگتی ہیں۔ اوزان رباعی پر ان کی مکمل گرفت ہے۔ ڈاکٹر زار علامی (۷ر فروری ۱۹۹۳ء)

تسلیم نیازی بلاشبہ ایک ذہین شاعر ہیں۔ آمر صدیقی (۱۹۹۳ء)

مجموعے کا مطالعہ کیا۔ عشق اور ریاضیت کے علاوہ خون جگر کی آمیزش شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کے لئے کتنی ضروری ہے اآپ اور ہم اس سے سبھی واقف ہیں۔ آپ کے کلام میں سوز وگداز ہے۔ خیالات ہیں........ مجھے امید ہے کہ آپ مستقبل میں اپنی مزید تابنا کی کا ثبوت دیں گے۔

اویس احمد دوراں (۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء)

آپ کی شاعری کا میں مداح اور معترف ہوں۔ مشق ومزاولت جاری رکھئے۔ آپ محض نغز گو شعر ہی نہیں اچھا تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں۔ آپ میں شاعرانہ صلاحیت فطری ہے اسے محنت کے ساتھ آگے بڑھائیے۔ آپ کی ادبی صلاحیت سے امید ہے کہ ایک نہ ایک روز ادب میں ایک اعلیٰ مقام ضرور حاصل کرلیں گے۔ آپ کی غزلوں میں شعری پیکر لطیف جمالیاتی حس لئے نظر آتے ہیں۔ آپ کی بعض علامتوں میں پرت پرت معنویت پائی جاتی ہے مثلاً

وہ شخص میری ریڑھ کی ہڈی سے ڈر گیا
ورنہ وہ مجھ کو کیوں مجھے کیوں لوٹا کے گھر گیا
اب آبرو ہے اجنبی موسم کے ہاتھ میں
سورج کنواری مٹی کی بو سونگھ کر گیا

مواخز الذکر شعر میں Sex symbo بڑے نازک پیرائے میں ظاہر ہوا ہے۔

''کوئی حادثہ؟''
''نہیں، خودکشی!''

چار لفظوں میں آپ نے نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ موجودہ حیات کی بے معنویت کا اس سے بہتر اظہار کیا ہوسکتا ہے۔ آپ کی نظموں اور غزلوں کے علاوہ دوہے، ماھئے، ترائیلے، سانٹ، رباعیاں سبھی بہت خوب ہیں۔ آپ سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ کرامت علی کرامت (۱۹ر ستمبر ۱۹۹۲ء)

تسلیم نیازی نوجوان ہیں۔ کسی ادیب یا شاعر کا نوجوان ہونا بذات خود کوئی وصف نہیں لیکن اگر کم عمری میں ہی چکنے چکنے پات نظر آرہے ہوں تو بروا کے ہونہار ہونے کی اطلاع تو دی ہی جا

سکتی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہے کہ تسلیم نیازی کا ذہن تجربہ پسند ہے.......وہ غزل تو کہتے ہیں کہ اردو کا ہر شاعر غزل کہتا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ رباعی بھی کہتے ہیں جسے عموماً پختہ مشقی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔.......جو شاعر کھلے ذہن سے سوچتا ہو اور موجودہ دور کی شاعری کے بڑے دھارے سے منسلک ہو وہ ہماری پذیرائی کا مستحق ہے۔

مظہر امام (۳/مئی ۱۹۹۲ء)

آپ کے تجربہ پسند ذہن نے لفظوں میں جس طرح اپنے آپ کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے وہ تخلیقی سفر کے روشن امکانات کا اشارہ ہے۔ آپ نے جو راہ اپنائی ہے وہ مشکل تو ضرور ہے لیکن یہی زندہ ادب کی ضروری شرط بھی ہے۔ آپ کی شاعری اچھی ہے۔ اس میں فکری تساہل کی جگہ تجسس کی حرکت قاری کی شناخت کرتی ہے۔ مختلف اصناف میں آپ کی طبع آزمائی بھی تخلیقی زرخیزی کا احساس دلاتی ہے۔

ندا فاضلی (۲۲/نومبر ۱۹۹۳ء)

ان (تسلیم نیازی) کی تخلیقات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ نئی نسل میں کچھ ایسے خالقین ہیں جن سے اچھی امیدیں باندھی جا سکتی ہیں۔ تسلیم نیازی نے نظمیں اور غزلیں دونوں کہی ہیں۔ انکے اسلوب اور لہجے میں نیا پن ہے۔ مضامین کی تلاش و جستجو بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ خوبی انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔

ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی (۸/فروری ۱۹۹۲ء)

تسلیم نیازی کی تخلیق شخصیت ان کی نظموں سے متشکل ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی منظومات میں نئے محسوسات اور تجربات کو سمیٹنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ موضوعات کے انتخاب میں وہ خاصے Selectve ہیں۔ لب ولہجہ کے نئے پن، الفاظ کا غیر رسمی استعمال، علامات و اشارات، منفرد بحر و وزن اور ایک مخصوص صوتی نظام سے تسلیم نیازی نے نظم نگاری کو ایک نئی آواز بخشنے کی ابتدا کی ہے۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی (۱۲/جنوری ۱۹۹۳ء)

معاصر شعرا میں تسلیم نیازی کا نام جانا پہچانا ہے۔ ان کی اکثر رباعیاں نظر سے گزری ہیں۔ ان رباعیوں کے مطالعے سے محسوس ہوا کہ تسلیم نیازی کی طبیعت رباعی سے میل کھاتی ہے۔ وہ اس کے مزاج آشنا ہیں اور اس کے رموز و آداب پر نگاہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق (۱۵/مئی ۱۹۹۶ء)

.......غزلیں تو بہت عمدہ کہتے ہیں آپ اور نظمیں بھی لیکن بھلے آدمی، زبان و بیان اور

اوزان و بحور پر اتنا عبور رکھنے کے باوجود لوگ باگ جن نثر پاروں کو نثری نظم کا نام دئے ہوئے ہیں اور نامِ تجربہ اپنے عجز کی پردہ پوشی کر رہے ہیں ان کی ہمنوائی آپ جیسا قادر الکلام شاعر کیوں کرے!

عتیق احمد عتیق (۵/جولائی ۱۹۹۳ء)

تسلیم نیازی نے روایتی اور تقلیدی عناصر سے خود کو الگ رکھا ہے........حیات کی سچائی کو پیش کرنے کے لئے تسلیم نیازی نے تجربہ و مشاہدہ سے سونا تراشا ہے........صحت مند روایات کے تناظر میں انسانی نفسیات کی ترجمانی جس اعلیٰ سطح پر ہوئی ہے اس میں ان کی انفرادیت پوشیدہ ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (۱۹۹۳ء)

نیازی کی شاعری کا موضوع پھیلا ہوا ہے۔ زبان و بیان پر ان کی بھرپور گرفت ہے۔ آنے والا دور انکی شاعری کا ایک تابناک دور ہوگا۔ موصوف کی خصوصی طور پر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ غزل کی طرف خصوصی توجہ دیں۔

ڈاکٹر مظفر بلخی (۱۷/جنوری ۱۹۹۴ء)

تسلیم کی فکری بلوغت، احساس کی رفعت یہ ظاہر ہونے نہیں دیتی کہ وہ ابھی نوجوان ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر سے بہت آگے ہیں۔

ڈاکٹر رفعت اختر (ایکم نومبر ۱۹۹۲ء)

بھائی تسلیم نیازی.........خدا کرے آپ اچھے ہوں شب خون کے نام آپ کا خط مل گیا تھا۔ شمارہ ۱۶۹ میں شامل کیا جا رہا ہے.........علم العروض پر زیادہ محنت صرف کرنے سے آپکی تخلیقی قوت اثر انداز ہو سکتی ہے۔ آپکے اندر بے پناہ خلاقانہ قوت ہے لہٰذا اسے ضائع ہونے سے بچائیے۔

نعیم اشفاق (چودھری ابن النصیر) (۲۵/مئی ۱۹۹۳ء)

اس میں کوئی شک نہیں کہ تسلیم نیازی بلا کے ذہین ہیں۔ خود ان کے تنقیص کار بھی انکی ذہانت کا لوہا مانتے ہیں۔

پروفیسر طٰہٰ شمیم (۲۰/ستمبر ۱۹۹۳ء)

تسلیم نیازی کی شخصیت بھی ''ڈالفن'' کی مانند ہے۔ صاف ستھری، مترنم اور اخلاص کے پیکر۔۔۔۔ایک دن ''بزم بے تکلف'' کی نشست میں ان کی زبانی ان کا یہ شعر سن کر جی خوش ہو گیا اور میرے وہ قابلِ توجہ بن گئے

میں نے دیوار بوئی تو کچھ بھی نہیں

کنکری اس نے پھینکی تو گھر اگ گیا

جلیل عشرت (۱۴ر ستمبر ۱۹۹۰ء)

تسلیم نیازی شاعری کی دنیا میں ایک نیا نام ہے۔ مگر ان کی تخلیقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تجربات کافی پختہ ہیں اور ایک عمر تک حیات کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے خیالات کی پختگی کا رنگ انکی نظموں میں گہرا ہے۔ غزلوں میں بھی ویسے نئی نئی تمثیلیں ہیں......... ان کی شاعری ان کی وسیع النظری کی شاہد ہے۔ جلد ہی وہ شعر و سخن کی دنیا میں اپنا مقام بنالیں گے۔

معراج احمد معراج (۷ر جنوری ۱۹۹۱ء)

نصف سال قبل تسلیم نیازی سے میرا تعارف ہوا۔ اس درمیان کئی ادبی نشستوں میں ان کے کلام سننے کو ملے۔ کلام کی لطافت، زبان و بیان کے بانکپن، لفظوں کی آرائش و زیبائش اور اظہار کی دلکشی اور عمدگی کی دہلیز پر کھڑا یہ ننھا منا شاعر اپنے قد و قامت سے کہیں زیادہ بلند اور عظیم لگا۔

نذیر احمد یوسفی (۱۰ر فروری ۱۹۹۲)

تمہارے ہونٹوں پہ ہیں چیختی خاموشیاں مری

مرے سینے میں گم صم ہیں تمہاری بولیاں بچو

یہ شعر کسی نام نہاد شاعر کی جھولی میں ہوتا تو اب تک غزل کی پیشانی پر ہمارے نقاد اسے جھومر بنا کر ٹانک دیتے۔ مبارک

نذیر فتح پوری (۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۳ء)

تسلیم نیازی ایک کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر ہیں۔ رسائل و جرائد کے توسط سے انکی تخالیق اکثر و بیشتر نظر نواز ہوتی رہتی ہیں۔ ویسے ۱۹۹۲ء میں ''ڈالفن'' کے زیرِ عنوان ان کا ایک شعری مجموعہ بھی منظر عام پر آ چکا ہے جس میں غزلوں پر نظموں کا غلبہ نظر آتا ہے۔

عروض کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی باریکیوں پر خصوصی توجہ دیتے ہیں انکے کلام کا جائزہ لینے کے بعد پتا چلتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام حقیقت افروز ہے جسے انہوں نے پر شباب انداز میں پیش کیا ہے تاکہ زندگی کی تلخیاں محض تلخیاں ہی نہ رہ جائیں، غم محض غم ہی نہ رہ جائیں۔ ان میں مسرتوں کے غنچے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ تسلم نیازی کا

اندازِ بیاں انتہائی سادہ مگر اتنا ہی دلنشیں ہے۔ بے تکان غزلیں کہتے ہیں اور باوضع شعر نکالتے ہیں۔

قیصر عزیز

محبی تسلیم نیازی صاحب   سلام مسنون

اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ ''رنگ کے تازہ شمارے میں جناب آمر صدیقی کا تبصرہ نظر نواز ہوا۔ حیرت ہوئی کہ غیر صحت مند تبصرہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے تبصرہ میں جس شعر کا حوالہ دیا ہے وہ آپ کے مجموعے'' ڈالفن میں ہے ہی نہیں۔ یقین ہے آپ کی نگاہ سے بھی یہ تبصرہ گذرا ہوگا اور آپ کو رنج بھی پہنچا ہوگا۔ اس المیہ کو کیا کیجئے کہ آج بھی کچھ پڑھے لکھے قسم کے مبصر کتاب کا مطالعہ کئے بغیر تبصرہ کرتے ہیں اور خود کو ''تیس مار خاں'' کے خانے میں فٹ کروانے کی سعی بد حاصل کرتے ہیں۔ آپ کا غصہ یا رنج فطری ہے لیکن ضبط و صبر کو بھی فطری بنا لیجئے کہ

''جوابِ جاہلاں باشد خموشی''

یہی آمر صدیقی کا علاج ہے۔ دعا گو   محبوب انور (۱۵/۱۱/۹۳)

یوں تو تسلیم نیازی نے قدیم و جدید تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنا انفرادی نقش چھوڑا ہے لیکن فطری طور پر ان کی تخلیقی جڑیں غزل اور رباعی میں پیوست ہیں۔

سلیم سرفراز (۱۹۹۱)



تسلیم شدہ نیاز مند شاعر کی طرحدار شاعری

عزیز گرامی قدر جناب تسلیم نیازی سے اس خاکسار گوشہ نشیں کے بیس بلکہ پچیس سالہ والہانہ جذباتی روابط ہیں۔ وہ اس خاکسار کی طرف کیوں ملتفت ہوئے میں نہیں جانتا۔ میں ان کی متجسسانہ طبیعت کی نئی نئی زمین اور نئے نئے آسمان کی تلاش میں افق تا افق چھان مارنے کی سعی مسلسل کی وجہ سے انہیں پسند کرنے لگا۔ دیکھا نہ میں نے انہیں تھا نہ انہوں نے مجھے۔ یہ بھی ان کی طرحدار نیازمندی کا اعجاز ہے کہ وہ مجھے اپنا استاد کہتے ہیں۔ خود میرا حال یہ ہے کہ میں ان بے شمار حضرات کو بھی اپنا شاگرد کہتے ہوئے خوفزدہ رہتا ہوں جو بیسیوں برس لہو نچوڑنے کے بعد بھی راہ چلتے بے نیازانہ گزر جاتے ہیں۔ سچی بات یہی ہے کہ جناب تسلیم کی شاعرانہ عظمت خداداد ہے۔ فطرت نے خود بخود اس لالہ کی حنابندی کی ہے اور آج ان کی سرخروئی ان کی اپنی محنت اور کاوش کے لہو کی دین ہے کسی کا عطیہ نہیں۔ کبھی کبھی شاذ و نادر ایک آدھ لفظ یا اصطلاح یا فنی نکتے کے بارے میں پوچھ لینا استادی شاگردی کی تعریف میں نہیں آتا۔

البتہ یہ خاکسار تسلیم نیازی صاحب کا ممنون ہے کہ بیسیوں برس پہلے ایک شاعر کے ساتھ ایک عروضی تنازعے میں انہوں نے پہلے پہل اس فقیر کو قاضی یا مفتی کے منصب پر بٹھا دیا اور اس روایت کا وہ ابتدائی پودا رفتہ رفتہ یوں شاخ در شاخ، پھولتا اور پھلتا گیا کہ ادبی دنیا میں بعض ذی نظر اصحاب نے بھی باضابطہ اس خاکسار کو مفتیٔ ادب کہنا شروع کر دیا۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

پھر یکایک خدا جانے کیا ہوا کہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ایک محیر العقول معمہ رونما ہوا۔ باقاعدہ پوری طرحداری کے ساتھ میدان پر میدان مار لینے کی شہرت کے چوتھے آسمان پر پہنچ کر یہ ستارہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ گاہے ماہے بس ایک حضرت نذیر احمد یوسفی صاحب یہ اطلاع بہم پہنچا دیتے تھے کہ آسمان ادب کا یہ درخشاں کوکب کبھی کبھار طلوع ہو جاتا ہے۔

جون ۲۰۰۹ء میں میری علالت کی خبر سن کر جناب مسرت حسین عازم کی معیت میں عیادت کو حمزہ پور تسلیم نیازی صاحب تشریف فرما ہوئے۔ انہیں دیکھ کر جی خوش ہوا اس اطلاع سے مزید مسرت ہوئی کہ وہ آسمان ادب پر طلوع ہو کر از سرِ نو روشنی بکھیرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور

تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ ان کا ''دیوان'' عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے۔ پھر ایک باران کی یہ محض نیازمندانہ خاکساری ہی ہے کہ غزلیں بھیج کر چند سطور لکھ دینے کی فرمائش کی ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ شاعر وہ اس ناچیز سے بہتر ہیں۔ وہ جس طرح متداولہ لفظیات وتراکیب کو اظہار کا ایک نیا روپ، ایک اچھوتا انداز عطا کر کے نئی معنویت عطا کر دیتے ہیں وہ بس انہیں کا حصہ ہے۔ مجھے ان کا یہی انداز بڑا پیارا لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پہلے چند غزلوں کے مطلعے حدیۂ ناظرین کروں۔

پھول، تتلی، پیڑ آنگن سوچنا
اف جوانی میں لڑکپن سوچنا

بے چین کل تھے تم بھی سو کہنے میں شرم کیوں
روئے نہ رات بھر تو یہ آنکھوں پہ ورم کیوں

سبھی تو خود کو سمجھتے ہیں آشنائے غزل
سو کس کو ٹال دیں کس کو گلے لگائے غزل

نکل کے دل سے یقیں کا سنپولیا تسلیم
کہاں گیا؟ ارے کس اور ہولیا تسلیم

غیروں کو دودھ کی دھلی تھیلی کی تھیلی دھوپ
میرے لئے بس اتنی سی میلی کچیلی دھوپ

ہو جائے نہ غالب کہیں امکان پہ شک، بھیج
جھوٹی ہی سہی دل کو تسلی کی کمک بھیج

احساس کے سرہانے اے جذبوں کے دف نہ چیخ
سوئے ہیں آج ہی مرے اہلِ کہف، نہ چیخ

ممکن ہے کوئی وجہِ تحیر نکل آئے
پھر شمر کے خیمے سے کوئی حر نکل آئے

وہ سراپا ناز ہے غیروں کا داعی ان دنوں
مجھ پہ ہی نافذ ہے حکم امتناعی ان دنوں

کوئی ایک مطلعہ بھی ایسا نہیں جو باتمام وکمال مانوس لفظیات پر مشتمل ہونے کے باوجود محض اپنے فنکارانہ برتاؤ نیز انداز اسلوب کے سبب ایک ناچشیدہ ذائقے کا احساس نہ کراتا ہو۔اسی کا نام قادرالکلامی ہے۔ جی کھول کر شاعر کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔تسلیم کے اسی فنکارانہ انداز کو ایک زمانہ تسلیم کرتا ہے۔اکثر وبیشتر بعض معتبر نیز جدت طراز سمجھے جانے والے معاصرین کے منہہ سے پھول جھڑتے دیکھا سنا ہے کہ اردو شاعری میں بیشتر کثیرالاستعمال الفاظ اور علامتوں نے گھس پٹ کر اپنے معنیٰ کھودیئے ہیں نیز فرسودگی کی حد تک ناقابل استعمال ہوچکی ہیں۔مثلاً صید وصیاد گلشن ونشیمن، جفا وفا، ستمگر، زنداں وقفس، قاصد ورقیب، عشق وشق، عبا قبا، فرہاد وتیشہ، شمع وپروانہ، بہاروخزاں وغیرہ۔

اب دیکھئے کہ انہیں اوران جیسے دوسرے بیشتر مبینہ طور پر فرسودہ الفاظ کو جناب تسلیم نیازی نے بکمال چابک دستی نیز قابل رشک فنکاری اور قدرت کلام کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذکورہ تمام غلط سوچ رکھنے والوں کو کس طرح دندان شکن جواب دے دیا ہے اور یہ دکھا دیا ہے کہ شاعر ہنرمند ہو اور زبان کے متنوع استعمال پر قابو رکھتا ہو تو ان فرسودہ سمجھے جانے والے الفاظ وتراکیب کو نئے زاویے سے استعمال کر کے تازہ کار معنویت عطا کر دیتا ہے۔مثلاً

صیاد کی راحت میں خلل ڈالتے رہیو
کچھو نہ کبھی سلسلۂ آہ و بکا بند
رنگ آپ کا محتاج مہک آپ کی مرہون
گل آپ کے خدام، بہار آپ کی باندی
تری گاڑی میں اے دنیا نشستیں سب کی خاطر
تھیں
میں اک تنہا مسافر رہ گیا سامان پر بیٹھا

لشن کی سیاست سے پریشاں ہیں پرندے
کہتے ہیں کہ اچھی تھی صعوبت ہی قفس کی
تیشہ ہے ننگِ جذبۂ بے اختیارِ شوق
سینے سے پتھروں کو نہ جھیلے تو کیا مزہ؟

الغرض یہ کہ فنی ولسانی ہر دو سطح پر آپ نے نہایت احتیاط پسند اور بالغ نظر ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ جہاں تک غزلیہ شاعری کا تعلق ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ نئے تغزل کی مزاج دانی کے بھی قدم بقدم نادر شواہد پیش کئے ہیں۔ نفسِ مضمون کی پیشکش میں نیمے دروں نیمے بروں کی فنکاری کے بیش بہا نمونے آپ کی غزلوں کی جان ہیں۔ایسا بھی نہیں کہ تسلیم صاحب محض خیالی دنیا کی سیر فرماتے رہے ہیں بلکہ پاس پڑوس سے لے کر ملکی وبین الاقوامی حالات وکوائف پر بھی آپ کی نگاہ رہی ہے۔عصری مشکلات ومسائل کی جھلکیاں بھی ان کے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز بیان کے پردے میں ان کے کلام بلاغت نظام میں دیکھی جاسکتی ہیں۔مختصراً یہ کہ آج کے دور میں بامعنیٰ جدید شعراء میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔

ناوک حمزہ پوری

تسلیم نیازی کا شعوری فن

پروفیسر علیم اللہ حالی

آج سے کوئی پندرہ بیس سال پہلے مجھے تسلیم نیازی کی شاعری کا عرفان حاصل ہوا تھا۔ میں نے اس کا اعتراف بھی کیا تھا لیکن یکا یک ایک طویل عرصے تن وہ اپنی خاموشیوں کی دھند میں کہیں کھو گئے۔ میں اس گوہر گم گشتہ کی بازیافت کے لئے شور وغوغا کرتا رہا لیکن ان کی بے نیازی کے سامنے مجھے سپر انداختہ ہونا پڑا۔ادھر دو تین سال قبل ایک محفل شعروادب میں شرکت کے لئے آسنسول گیا تو انہیں تلاش کیا، وہ مل گئے۔خاموشی کا سبب دریافت کیا تو ''فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں'' جیسے گھسے پٹے جواب سے مجھے مطمئن کرنا چاہا۔اس ملاقات میں مجھیہ اندازہ ہوگیا کہ میں جسے ان کی خاموشی سمجھے ہوا تھا وہ دراصل ان کے اس مجاہدے کی صورت حال تھی جس کے تحت وہ اس مدت میں اپنے اندرون میں اتر کو غزل سے ''صحبت صحیحہ'' کے عمل میں مصروف تھے۔ان کا کلام سنا تو پتہ چلا کہ یہ سارے مہ وسال بیکار نہیں گئے تھے، اس عرصے میں وہ غزل میں مکمل طور پر اترنے اور اسے اپنے اندر اتارنے کے یوگا میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔

غزل بنیادی طور پر نیم گفتنی کا آرٹ ہے اور غور کیا جائے تو یہ کام اظہار وبیان کی سطح پر نہایت دشوار ہے۔غزل کے شاعر کے پاس وہ شعور یا وہ ہنر ہونا ضروری ہے جس کے ذریعہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ تخلیقی تجربے کے کس حصے کو خفا میں رکھے اور کہاں سے اسے ظاہر کرے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اظہار واخفا کے مناسب تناسب کا احساس واندازہ بھی ہو۔کن محسوسات و کیفیات کے جزوی اظہار سے ان کی شدت تک رسائی حاصل ہوسکتی ہے۔اس کے تخمینہ کرنے کا سبق کلیتاً سیکھنے سکھانے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب فنکار کے پاس غیب سے مضامین اترنے لگتے ہیں اور اس کے صریر خامہ میں نوائے سروش کی خصوصیت پیدا ہوجاتی ہے۔

اچھے اشعار کی تفہیم کا مسئلہ یہیں حاصل نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے لئے قاری کی اس غیر معمولی ذہانت اور انتقادی حس کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اختراع اور تخلیق سے قریب ہو۔ ایسا قاری ناگفتہ کو بھی سرحد گفتار تک لے آتا ہے۔ یہاں قاری فنکار کی تخلیقی شخصیت کی تکمیل کا

ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ ان معنوی Gaps کو بھی پر کرتا ہے جسے پر کرنا یا تو فنکار ضروری نہیں سمجھتا یا جو اس کے حلقہ اظہار میں آنے سے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح شعر میں مفہوم کی تکثیریت پیدا ہوتی ہے اور فنکار کے ذریعہ تعمیر شدہ آئینہ عام قاری کے پاس پہنچ کر نگار خانہ بن جاتا ہے۔

تسلیم نیازی تخلیق شعر کے ان نازک امور سے واقف ہیں۔ ان کے اشعار ذہین قاری کی شرکت ضروری سمجھتے ہیں۔ اشعار کی لطافت اس وقت سوا ہوجاتی ہے جب قاری احساس وخیال کی Galloping کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ان کے اظہار کی سادگی اور سہل بیانی اکثر وبیشتر دھوکا بھی پیدا کرسکتی ہے۔ ان کے تخلیقی میلان کو میر سے قریبی نسبت ہے۔ میر ہی کی طرح تسلیم نیازی کے سادہ سے سادہ شعر میں احساس وفکر کا ناقبل پیائش عمق ہے۔ نیم گفتنی کی فضا میں اس گہرائی کو مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعہ بطور خاص محسوس کیا جاسکتا ہے:

پلکوں پہ جگنوؤں کا تقرر نہیں تو کیا — آنکھوں میں تیرگی سے تعصب ضرور ہو

نالہ کبھی فراز جگر تک نہیں گیا — آنسو کبھی نشیب نگہ تک نہیں گئے

میرے دل سے وہ نکل کر دیکھے — دیرا تنا ساحرم اتنا سا

دیوانہ ہوگیا ہے نیازی کہ دیکھئے — آنکھوں میں خوں نہ اشک، دہن میں ہے کف نہ چیخ

ایک مدت پہ کوئی پوچھنے آیا ہے مزاج — آج ہوتے جو مری آنکھ میں آنسو موجود

اس درجہ صبر وضبط کہ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ — زخموں کا بھی اگر کوئی سی لے تو کیا مزہ

دو پل کبھی سکون سے رہنے نہ دے کوئی — تو چھوڑ دے مجھے تو زمانہ دبوچ لے

محسوسات کے داخل میں سرایت کرتے ہوئے اور معانی کے اندرون میں طبق طبق تہیں بنانے والے تسلیم نیازی کے اور بھی اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ میں نے تو بطور نمونہ تسلیم کو یہ بشارت دینے کے لئے محض چند اشعار نقل کئے ہیں کہ انہیں میر کی چھت مل چکی ہے:

مجھ ایسے خاک نشینوں کی دل دہی کے لئے — کبھی تو میر کی چھت سے اتر کے آئے غزل

تسلیم نیازی کی شاعری موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے بھی متمول ہے۔ سماجی تقاضے (Social Commitments) نیازی کے یہاں شعری اشارات کے ذریعہ ادا ہوتے ہیں اس لئے یہ بھی ان کے منفرد تخلیق رویے کی پہچان بن جاتے ہیں۔ معاشرت، سیاست، عالمی مسائل،

اجتماعی کرب، محبت، جنس، صارفی نظام میں بدلتے ہوئے انسانی رشتے.... غرض وہ سارے مشاہدات نیازی کے یہاں موجود ہیں جو عصر حاضر کے ذہن بیدار کا پتہ دیتے ہیں، لیکن نیازی نے ہر مقام پر غزل کو ناغزل بننے سے بچالیا ہے۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ نیازی کے یہاں تندی صہبا کے باوجود آبگینے کے پگھلنے کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ غزل میں تصرفات کی حدیں بھی جانتے ہیں۔ انہیں یہ احساس ہے کہ:

غزلیں مری منظور ہیں کچھ اہل نظر کو — ہر چند کہ در بات تغزل کی ہیں راندی

مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد تسلیم نیازی کا وہ احساس دور ہوجائے گا جو محولہ بالا شعر کے دوسرے مصرع سے ظاہر ہوتا ہے۔ قارئین اور خود فنکار کو یہ اندازہ ہوجائے گا کہ تسلیم نیازی انفرادی لہجے کے ساتھ تغزل کے مفہوم میں اضافہ کررہے ہیں۔ اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر دو تین اشعار اور دیکھئے:

رہائی ہاتھ نے دے دی تو پھینکا جال آنکھوں نے — قفس سے اڑ گیا طوطا تو روشن دان پر بیٹھا

تری گاڑی میں اے دینا نشستیں سب کی خاطر تھیں — میں اک تنہا مسافر رہ گیا سامان پر بیٹھا

بیش وکم کوئی پیادہ، کوئی فرزیں، کوئی رخ — کون اس شہر میں اس شخص کا مہرہ نہ ہوا

تسلیم نیازی کی شاعری سیل تند خو نہیں بلکہ جوئے نغمہ کی ضامن ہے کہ غزل ہم سے اس کا تقاضا کرتی ہے۔ میں نیازی کے تازہ مجموعے کا انتظار کررہا ہوں۔



بالائے شعر

اپنی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا عجیب سا لگتا ہے۔ میری نظر میں یہ اس قابل ہے بھی نہیں کہ اس کے بارے میں کچھ کہا جائے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں ہی اسے رد کردوں تو آپ اس کا کیا کریں گے! اور پھر میں کوئی نقاد بھی نہیں کسی کی شاعری کو رد کرنے کا حق مجھے کہاں سے حاصل ہوگیا......خواہ وہ شاعری مجھ سے ہی منسوب کیوں نہ ہو!

معذرت خواہ ہوں کہ اپنی So-called تخالیق کو میں بار بار شاعری سے موسوم کئے جا رہا ہو۔ معلوم نہیں کہ یہ شاعری ہے بھی کہ نہیں لیکن مجبور ہوں کہ جس چیز کو سید جلال الدین احمد کاکوی صاحب جیسی عبقری شخصیت نے پسند کرلیا ہو اسے مجھ سا ہیچمدان reject کرنے کی ہمت کیسے کرسکتا ہے۔ اپنے علاوہ میں اگر کسی سے ڈرتا ہوں تو بس جلال کاکوی صاحب سے.........اور یہ ڈر حق بجانب بھی ہے کہ مجھ جیسے سخت جان کو Confused کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ۔ بہت ساری خوبیوں کے مالک ہیں جلال کاکوی اور تمام خوبیاں ان کے اندر اپنی صحیح مقدار میں موجود ہیں۔ ایک Perfect man ہیں وہ۔ تھوڑی بہت Perfection اگر میری تخالیق میں بھی آپ کو دکھائی دے جائے تو ایسی حالت میں جلال کاکوی کی پذیرائی آپ پر فرض ہوجاتی ہے........کہ میری شاعری میں اگر کچھ ہے تو یہ انہی کی گونا گوں شخصیت کا عکس ہے۔

سطور بالا میں جلال کاکوی صاحب کے تعلق سے میری حق بیانی کو تملق نہ سمجھا جائے کہ میں نے انہیں فرشتہ نہیں لکھا ہے۔ میں تو انہیں ایک مکمل آدمی سمجھتا ہوں ”قریب رہنے والے کی پرورش (اقربا پروری)“ بھی ایک مکمل آدمی کے بنیادی اوصاف میں شامل ہے۔ لہٰذا مجھے کہنے دیجئے کہ مجھ جیسے ایک قریب رہنے والے اور اس پر مستزاد کہ پندرہ بیس برسوں سے قریب رہنے والے کی تخالیق کو قابلِ اعتنا سمجھنا اور ان کی ترتیب واشاعت کی صعوبت گوارہ کرنا جلال کاکوی صاحب کے اسی manhood کا پس منظر ہے۔ میری خواہش ہے اور گذارش بھی کہ آپ ان کے اسی کاز کی قدر دانی کریں۔

تسلیم نیازی

غزلیات

تسلیم نیازی

تاحد نظر غبار بابا
کس کا ہے اشتہار بابا
چھوتی ہے دھول آسماں کو
یہ کون ہے شہسوار بابا
ٹوٹے ہیں ہاتھ چاک دامن
مانگیں بھی تو کیا پیار بابا
یہ جینا بھی ہے کوئی جینا
مرنا ہے قسط وار بابا
دل میں اب ولولے کہاں ہیں
خالی ہے یہ کچھار بابا
جھوٹوں سے ہے بھری یہ دنیا
میں بھی کیا حق شعار بابا
لب کھولے کوئی حضور اس کے
کس کو ہے اختیار بابا
بنٹتے ہیں عہدہ و مناصب
ہوتا ہے کاروبار بابا

خاموش رہا کرتا ہوں اس خوف سے بابا
اچھا نہیں لگتا ہے اسے شور شرابا
اس بار بھی سر ہو نہ سکا معرکۂ شوق
یوں رات گئی بیت کہ اک پاؤں ہی دابا
یہ آپکی تقدیر ہے یہ میرا مقدر
یہ آپ کا خس خانہ ہے یہ میرا خرابا
تو خیر منا اے مری آنکھوں کے شناور
اڈانہ کبھی سامنے تیرے یہ دوآبہ
کچھ روز سے دل کی طرف آتے نہیں ارماں
کہتے ہیں کہ ہوتا ہے یہاں خون خرابا
حاجات مری اور ترے الطاف کے مابین
درکار ہے بس ایک خوشامد کا قلابہ
یہ عجز بیاں میرا، تری شانِ سماعت
اک پانچ ستارہ ہے تو اک راہ کا ڈھابا

دشمن تھے ہزاروں میں مرے، گھر نہیں جاتا؟
اک دوست کے قدموں پہ جو میں گر نہیں جاتا

غم ہو کہ بلا ہو کہ مصیبت ہو کہ مشکل
آتا ہے جو اک بار مسافر نہیں جاتا

باغوں میں کہ کھیتوں میں کہ دریا کے کنارے
تنہا مرے ہمراہ وہ شاطر نہیں جاتا

جو سحر کہ مجھ پر تری آنکھوں نے کیا ہے
اس اوجِ ہنر تک کوئی ساحر نہیں جاتا

مرنے کے مراکز تھے زمانے میں کئی اور
اے کاش میں جاں سے تری خاطر نہیں جاتا

یوں ضرب سزا کی مرے دل تک نہ پہنچتی
تو اپنی گواہی سے اگر پھر نہیں جاتا

کچھ روز سے مرا بھی نہیں ہے اتا پتا
اس پر یہ اتفاق کہ وہ بھی ہے لا پتا

جالوں میں اس کو چشم زدن میں جو چل پڑوں
میں پوچھ لوں تو اس کا بتادے ہوا پتا

یہ فصلِ گل ہے موسمِ وحشت ہے اس لئے
کب کیسے کتنا کون کہاں کس کو کیا پتا؟

چھائی ہوئی ہے اب بھی فضاؤں میں نغمگی
گزرا ہے کوئی نام تمہارا الاپتا

لفظوں کا وہ بدن نہ تغزل کا پیرہن
کوئی مدیر کیوں مری غزلوں کو چھاپتا

اب ''حسن ڈاٹ کام'' پہ ہیں دستیاب آپ
ہر بوالہوس کی جیب میں ہے آپ کا پتا

جنوں اچھا مگر ایسا جنوں اچھا نہیں لگتا
کہ غائب کیلئے حاضر کا خوں اچھا نہیں لگتا

وہ میرا دوست ہے، غیروں کو گرچہ دوست رکھتا ہے
اسے میں بے وفا کیسے کہوں اچھا نہیں لگتا

ذرا سی بات پہ کہتے ہو تم نمبر بدل لیں گے
کسی کو پل میں کرنا بے سکوں اچھا نہیں لگتا

نہ زورِ قوتِ بازو، نہ وصفِ جنگ آرائی
مرا دشمن بایں حالِ زبوں ، اچھا نہیں لگتا

میں اس پر جان تو دے دوں مگر لگتا ہے ڈر مجھکو
اگر تسلیم وہ کہہ دے کہ یوں اچھا نہیں لگتا

تجھے سوچا تو دل برجِ عظیم الشان پر بیٹھا
حقیقت میں شکستہ بازو و بے جان پر، بیٹھا

وہ اپنے شوقِ زودانزال کی بے اختیاری میں
مرے ہی قرب کی کائی زدہ ڈھلوان پر بیٹھا

رہائی ہاتھ نے دے دی تو پھینکا جال آنکھوں نے
قفس سے اڑگیا طوطا تو روشن دان پر بیٹھا

مجھے معلوم ہے رتبے ترے پہلو نشینوں کے
مجھ ایسے کا نہ تھا واں بیٹھنا آسان، پر بیٹھا

جیا اس کو سبھی نے، زندگی کے پاس سب بیٹھے
تم اس کی ناف پر بیٹھے، میں اس کی ران پر بیٹھا

تری گاڑی میں اے دنیا نشستیں سب کی خاطر تھیں
میں اک تنہا مسافر رہ گیا سامان پر بیٹھا

تجھے اک عمر تک میں نے سہیجا
مگر اب معذرت اے شوقِ بے جا
میں اپنے خوف سے اکتا چکا ہوں
مرے سینے سے یہ سامان لے جا
بلا کا اور کیجے خیر مقدم
وفا کو اور دل میں دیجئے جا
اسے معلوم ہے وقتِ ضرورت
کسے کہنا ہے آجا اور کسے جا
میں اپنا حالِ دل اس کو سنا دوں
اگر منہ کو نہیں آئے کلیجا
دل اس کو پھر مقابل چاہتا ہے
ہوا کو کس نے غبارے میں بھیجا

جان اتنی سی ہے، دم اتنا سا
اور سہنے کو ہے غم اتنا سا
میرے دل سے وہ نکل کر دیکھے
دیر اتنا سا حرم اتنا سا
میرے محبوب کا گھر دور سہی
ابھی قدموں میں ہے رم اتنا سا
ہوں گے اس شہر میں دشمن میرے
تو بھی ان سے نہیں کم اتنا سا
غیر پر لطف وکرم کی بارش
مجھ کو اللہ قسم اتنا سا
غیر کو دیجئے جا پہلو میں
مجھ کو بس زیرِ قدم اتنا سا
بوسہ دو گے تو سلیقے سے دو
زہر کھاتے نہیں ہم اتنا سا

اب وہ ہاں اور نہ ہوں بولے گا
اب چرا بولے گا چوں بولے گا

آستینوں کو پتا ہے کہ نہیں
ایک اک قطرہ خوں بولے گا

کیا خبر تھی کہ محبت کا نشہ
اسطرح روز فزوں بولے گا

عشق شہرت سے گریزاں ہے مگر
دل جلے گا تو جنوں بولے گا

مڑ کے مت دیکھیو وقتِ رخصت
اس کی آنکھوں سے فسوں بولے گا

اب غزل ہو کے رہے گی شاید
اب مرا سوزِ دروں بولے گا

تو ہی جو بولے تو بولے تسلیم
کون اس شہر میں یوں بولے گا؟

کھلتا نہ تھا یہ راز مگر کل کی شب کھلا
میری طرح اسے بھی ہے میری طلب کھلا

وہ میری حسرتوں کو پلاتا ہے آنکھ سے
رہتا ہے ساری رات مرے دل کا پب کھلا

ناگاہ کوئی آکے نہ پڑھ لے ورق ورق
اس طرح خود کو چھوڑ نہ اے بے ادب کھلا

کوئی کسی کے سامنے دل کھولتا نہیں
رکھتے ہیں ویسے شہر میں دروازہ سب کھلا

سچ بات جو کہی تو خفا ہوگئے جناب
یوں آج مجھ پہ آپ کا نام ونسب کھلا

حالت مریضِ دل کی بگڑ جائے جانے کب
تعطیل کے دنوں میں بھی رکھئے مطب کھلا

خود کو اے تسلیمؔ تھوڑا سا خرد والا بنا
تو سمندر اور پھرتا ہے ندی نالا بنا
زندگی کے تجربوں نے نوجوانی چھین لی
شوق سے پھرتا نہیں میں پیرِ صد سالہ بنا
گر تجھے مقصود ہے ترسیلِ سوزِ اندروں
تو اسے گریہ بنا، شیون بنا نالہ بنا
آندھیوں کا ہمنوا خیموں کا رکھوالا بنا
پھر کسی کی پھوٹتی آواز نے روکا مجھے
پھر کسی کا اشک میرے پاؤں کا چھالا بنا

پھول ، تتلی، پیڑ ،آنگن سوچنا
اف جوانی میں لڑکپن سوچنا
ایسے ویسے شعر کہنا دوستو!
اور پھر اس خبط کو فن سوچنا
کون ہوسکتا ہے دشمن آپ کا
چھوڑئے جس تس کو دشمن سوچنا
جانے کیا ہو مصلحت صیاد کی
چھوڑ دوں کیسے نشیمن سوچنا
آپ ہی کو زیب دیتا ہے جناب
رام کہنا اور راون سوچنا
اپنے سینے میں یہ کیا تسلیمؔ جی
لمحہ لمحہ اس کی دھڑکن سوچنا

چادر ٹٹولنا کبھی بستر ٹٹولنا
صحرا میں بھی میں بھولا نہیں گھر ٹٹولنا

ڈھونا سروں پہ دھوپ کی گٹھری تمام دن
آنکھوں سے رات بھر مہہ و اختر ٹٹولنا

بے چارۂ قفس کا جگر دیکھنا نہیں
صیاد کا ہمیشہ مرے پر ٹٹولنا

اللہ رے خود فریب خود آسودگی کا خبط
پھولوں کو سوچ سوچ کے پتھر ٹٹولنا

ایسا نہ ہو کہ سر سے ہی جاتا رہے جنوں
وہ برق زار ہے، اسے بچکر ٹٹولنا

چھونا جو ہو اسے کبھی آنکھوں سے ایکبار
سوبار اس کا فون سے تیور ٹٹولنا

میری فطرت نہیں بارود ہونا
مگر آسان ہے کیا عود ہونا

بجا ہے زندگی میں برد باری
مگر ایسے بھی کیا بے سود ہونا

زمانے پر ہوا ظاہر بالآخر
مرے دل میں ترا موجود ہونا

یہ کیا اے خوفِ این وآں کہ یونہی
ابھی مرنا ابھی مولود ہونا

تمہاری قید سے پانا رہائی
اسیرِ فکرِ ہست و بود ہونا

مرا رستے میں رک جانا نیازی
کسی کا منزلِ مقصود ہونا

سانحہ ایک ہوا، واقعہ دہرا نہ ہوا؟
ایک رسوائی ہوئی دوسرے شہرہ نہ ہوا؟

دل میں رہتا ہے تری یاد کا سورج روشن
اس کے آگے کوئی بادل کوئی کہرا نہ ہوا

کبھی ہونٹوں سے چلا دورِ شبانہ شب بھر
کبھی آنکھوں سے دوا اک جرعۂ ظہرانہ ہوا

بیش وکم ،کوئی پیادہ کوئی فرزیں کوئی رخ
کون اس شہر میں اس شخص کا مہرہ نہ ہوا

ترے حضور سزا کا عجب قرینہ ہوا
جو بے قصور ہوا وہ کبھی بری نہ ہوا

بہت دنوں پہ کسی خواب کا ہوا یوں گزر
عقیم چشم کو جوں بچۂ نرینہ ہوا

کوئی کبھی نہ ہوا جادۂ وفا میں مرا
کسی کے نام اگر جان بھی کری ، نہ ہوا

ہم اس کی راہ میں آنکھیں بچھانا بھول گئے
یہ خودکشی تو ہوئی ، شوقِ خودسری نہ ہوا

ہم اس عمل میں مثالِ چراغ جلتے ہیں
خیالِ یار ہوا ، کارِ سرسری نہ ہوا

ترا نزول تو اک[1] واقعہ ہوا کہ یہاں
ہوئے ہزار مگر تجھ سا عبقری نہ ہوا

---

[1] یہ شعر جلال کاکوی سے منسوب ہے

تھک گئے کیا ، رک گئے تم کیا ہوا
دعویٔ تسخیر قلزم کیا ہوا
ہوگئی پھر اس سے انبن تو نہیں
آج کل رہتے ہو گم صم، کیا ہوا
ہونٹ سنتے ہیں ترے ویران ہیں
جس کو کہتے ہیں تبسم، کیا ہوا
یہ تو ہے سرکار غیروں کی زباں
آپ کا طرزِ تکلم کیا ہوا
آپ نے بوسہ دیا صد شکریہ
یہ تو پیمانہ ہوا، خم کیا ہوا
شہر والوں کا تو کھویا ہے سکون
آپ کا تسلیم جی گم کیا ہوا

اب ذہن ودل پہ تیرے میں حاوی نہیں رہا
اچھا ہے 'ممبئی' میں 'دھراوی' نہیں رہا
تجھ سے بھی ہورہا مرا آخر کو دل اچاٹ
اک غم بھی بندگی کے مساوی نہیں رہا
اک داستانِ دردِ مسلسل ہے اور میں
لکھتا تھا جو نشاط وہ راوی نہیں رہا
آسیبِ خود سری سے زمیں کو خدا بچائے
اس کے گلے میں نقشِ سماوی نہیں رہا

جو عشق وشق کبھی پیار ویار میں نہ رہا
وہ مری طرح کہیں اشتہار میں نہ رہا

تم اتنے لگتے ہو پیارے کہ یہ دلِ کمبخت
کہیں جو دائرۂ اختیار میں نہ رہا!

اسے یہ زعم کہ وعدہ وفا کیا نہ کبھی
مجھے خوشی کہ کبھی انتظار میں نہ رہا

ترے قریب جو لاکھوں میں ایک تھا اے دوست
وہ آج حیف کسی بھی شمار میں نہ رہا

تو میرے ساتھ رہا بھی تو اس سلیقے سے
کہ رہ گزر میں رہا اور غبار میں نہ رہا

تمام عمر میں تسلیم جی رہا رسوا
وہ اس لئے کے تملق شعار میں نہ رہا

کب اختیار مجھے اس سے بڑھ کے تو نے دیا
کبھی کبھار نظر سے ذرہ سا چھونے دیا

مری غزل سے عبارت تھی عاجزی کی زباں
یہ رکھ رکھاؤ تری طرزِ گفتگو نے دیا

کبھی نہ بنتے یہ نقش و نگار ''درد افروز''
یہ حوصلہ تو مجھے ایک نیک خو نے دیا

مجھی کو آنکھ دکھاتے ہو اے چمن زادو!
یہ رنگ و نور تمہیں میرے ہی لہو نے دیا

میں دو قدم بھی زمانے کے ساتھ چل نہ سکا
کہ اتنا وقت کہاں تیری جستجو نے دیا

سبھی نے عشق کو مقدور بھر جلا بخشی
جگر جلا یا کسو نے یہاں کسو نے دیا

وہ مل گیا تو مری جستجو کا ہوگا کیا
شراب پی لی تو خالی سبو کا ہوگا کیا

عزیزو، مجھ سے نہ رکھیو کبھو امیدِ وفا
جو اپنا ہو نہ سکا وہ کسو کا ہوگا کیا

مری نظر میں تم ایسے کئی تونگر ہیں
تمہارے در پہ کوئی مجھ سا بھوکا ہوگا کیا؟

جو اس کے غم میں نہ بھیگے وہ آنکھ ہی کیسی
جب آب ہی نہ رہے گا تو جو کا ہوگا کیا

ترے بغیر مجھے فصلِ گل سے کیالینا
تو ہی نہ ہوگا تو اس رنگ و بو کا ہوگاکیا

حریمِ گیسوئے جاناں میں بیٹھ جاؤں جو میں
غمِ جہاں کے بگولوں کا لو کا ہوگا کیا؟

دل تو خیمے ہی میں اس سے بھر گیا
پھر میں کس کے ساتھ رستے بھر گیا

زندگی لکھنا نہیں آیا مجھے
جیسے تیسے سارے صفحے بھر گیا

ایک پل دشوار تھا جس کے بغیر
وہ بھی ابکے جینے مرنے بھر گیا

اشک آخر روتے روتے تھم گئے
زخم آخر رِستے رِستے بھر گیا

جو گئے اس پار کشتی بھر گئے
میں اکیلا تھا جو تنکے بھر گیا

دل میں یادوں کا امڈ آیا ہجوم
شام ہوتے ہی یہ کیفے بھر گیا

اک ذرا سا مجھ سے کیا مس ہوگیا
مجھ میں وہ مشہور نس نس ہوگیا

میں نہ ہوتا یوں ہی دیوانہ کبھی
''ہو!'' کہا اس شخص نے، پس ہوگیا

شوق کو اس حال میں دیکھا کہ اُف
ہنس کے جب اس نے کہا ''بس ہوگیا!''

دل ہے اس کی یاد ہی سے مطمئین
اب تو یہ شاہیں بھی کرگس ہوگیا

پا بجولاں ہوں مگر جولانیاں
دیکھ کے صحرا بھی محبس ہوگیا

چبھتا ہے میری قلندر آنکھ میں
خواب بھی کمخواب و اطلس ہوگیا

لطف تو غیروں نے مل جل کر لیا
میں نے ابکے بھی تحمل کر لیا

جب طبیعت آئی بلوایا مجھے
اور جب چاہا تغافل کر لیا

پتھروں کے درمیاں آرام تھا
دکھ تو اس نے پھولوں میں تل کر لیا

سب کی آنکھوں کے سبوچے بھر گئے
اس نے اپنے آپ کو مل کر لیا

رائگاں ہونے سے بچنے کے لئے
میں نے اپنے جزو کو کل کر لیا

ضبط کی حد ہی مقرر ہوگئی
میں نے بھی ابکے اسے کھل کر لیا

اس قفس میں اس سے بڑھ کر اور کیا
دل بھر آیا تو ذرا غل کر لیا

میں اور اظہارِ الم واللہ اعلم بالصواب
اس کی آنکھیں اور نم واللہ اعلم بالصواب

حاجتوں کے درمیان اک دوسرے کے واسطے
ہم زیادہ ہیں کہ کم واللہ اعلم بالصواب

اک زمانہ تھا کسی کے دل میں کرتے تھے قیام
اب کہاں رہتے ہیں ہم واللہ اعلم بالصواب

پوچھتے ہیں خیریت میری عدو کے فون سے
یہ کرم ہے یا ستم واللہ اعلم بالصواب

ہوگئے تسلیم جی روشن در و دیوارِ دل
کس نے رکھا ہے قدم واللہ اعلم بالصواب

اتری یہ مجھ پہ ہجر کی کیسی اسیم شب
مرنا ہزار بار پڑا تا بہ نیم شب

اس سے الگ تو مجھ پہ ہر اک لمحہ خار زار
وہ ساتھ ہو اگر تو خطِ مستقیم شب

برسوں کے بعد ملنے کی لذت بھی تھی عجیب
وہ بھی مہِ تمام ہوا میں بھی نیم شب

دن بھر کی ہاؤ ہو مجھے رکھے ہے خود سے دور
کھولے ہے آج کل درِ امید و بیم شب

میلی نہ ہو حیات کی چادر خدا کرے
ہر صبح ہو تمہاری زرِ باب، سیم شب

وعدہ کیا ہے اس نے پھر آئے گا جلد ہی
دے کر گئی ہے تحفۂ بادِ نسیم شب

تو دس ہزار سال کی ہوجایا کر کہ جب
آغوش میں ہماری رہے وہ مقیم شب

بھول جائیں گے جو سر رکھکے مرے شانے پر آپ
وقت کو مجبور کر دیں گے ٹھہر جانے پر آپ
ہیں اگر تانے پہ راغب مہرباں بانے پر آپ
ہیں کہ سلجھانے پہ مائل، اور الجھانے پر آپ
ہو بلند اقبالِ حسنِ آمرِ عالم پناہ
روز و شب مامور رہیئے مجھکو تڑپانے پر آپ
منہ کو آتا ہے کلیجہ، آنکھ میں آتا ہے دم
بات جانے کی نہ کیجئے مرے گھر آنے پر آپ
آجکل ہم رات بھر ہی رہتے ہیں مصروف کار
پیش دستی پر بضد ہیں اور شرمانے پر آپ
میری غزلوں کی زباں سے آپ ہی واقف نہیں
حال میرا شہر میں ہر شخص ہی جانے ، پر آپ

غیروں کو دودھ کی دھلی تھیلی کی تھیلی دھوپ
میرے لئے بس اتنی سی میلی کچیلی دھوپ
رکھتے ہو وقتِ وصل بھی چہرے پہ برہمی
یعنی کی جنوری میں بھی کڑوی کسیلی دھوپ
تیرے خیال ہی سے تو سینہ ہے میرا گرم
اس صحن میں تو ہے اُسی چھت کی طفیلی دھوپ
آنکھوں میں تیر اُٹھا دمِ رخصت جگر کا خوں
دن ڈھلتے ہی افق پہ شفق بنکے پھیلی دھوپ
ہوتی تھی روز جس کے تعاقب میں دوپہر
آتی کہاں تھی ہاتھ وہ کچی بنیلی دھوپ
پھر یوں ہوا کی میری شبِ برف زار کو
گرما گئی کسی کے حرم کی غصیلی دھوپ

رہی نہ عشق میں فکرِ مآل کی عادت
جگر بحالِ نیازی ، جلالؔ کی عادت

کبھی کبھی تو کئی وقت کچھ نہیں کھا کر
گئی نہیں ہے تمہاری خلال کی عادت

مری زباں پہ خدارا نہ جائیے صاحب
اِسے تو ہے یونہی بے جا سوال کی عادت

یہ زخم ہیں مرے محبوب کے لگائے ہوئے
انہیں ازل سے نہیں اندمال کی عادت

ادھر ہوس کی روایت اُدھر ادا کا رواج
اِدھر سوال، اُدھر قیل و قال کی عادت

میں عرضِ حال نیازیؔ کروں جو وہ چھوڑے
ذرا سی بات پہ جنگ و جدال کی عادت

ہو کون میرے جیسے بے نام و نشاں کا دوست
ملتا ہے یاں نصیب سے تجھ ایسا بانکا دوست

لیتا نہیں میں نام کہ ناموس کا ہے پاس
کہہ دیں نہ اہلِ شہر مجھے بھی فلاں کا دوست

بچپن کا ایک بھولا بڑھاپے میں یوں ملا
جیسے قفس میں آن ملے آشیاں کا دوست

تم ہو مقام والے سو رہتے ہو اس کے ساتھ
میں ہوں کوئی ستارہ نہ میں آسماں کا دوست

بنتی اسی طرح سے ہے زنجیر دوستی
گھوڑا یہاں ہے گھاس کا سگ استخواں کا دوست

ہوتا ہے سامنا تو ملا لیتا ہے وہ ہاتھ
ورنہ کہاں کی دوستی صاحب کہاں کا دوست

تا دیر کیوں رہے کوئی تسلیمؔ میرے پاس
ہوتا ہے تیر کچھ ہی پلوں تک کماں کا دوست

ہمی برے ہیں بڑے ہم ہی بدزباں ہیں بہت
یہاں وگرنہ ''تجمل حسین خاں'' ہیں بہت

برا کیا جو انہیں دعوتِ شراب نہ دی
جناب شیخ بجا مجھ سے بدگماں ہیں بہت

ہوس کی شعلہ گری تجھ پہ ہی نہیں موقوف
اگر ہو طاقتِ پرواز ، آسماں ہیں بہت

ترے شمار میں ہم ہیں سو بے نشاں ہیں بڑے
تری پناہ میں ہم ہیں سو بے اماں ہیں بہت

وہ دیکھ دیکھ کے دیکھا نہیں سا لگتا ہے
کہ اس کے جلوے بظاہر ہیں کم نہاں ہیں بہت

میرے گھر میں جناب کی آہٹ
جیسے صحرا میں آب کی آہٹ

زخم پر ہے بہار کی آمد
درد میں ہے شباب کی آہٹ

کون سنتا ہے یاں سوا اسکے
دلِ خانہ خراب کی آہٹ

چھوڑ دوں اس کے فون پر مسکال
بھیج دوں اضطراب کی آہٹ

(ق)

دل کا آتش کدہ ہوا روشن
گونج اٹھی التہاب کی آہٹ

ایک بے چین آرزو کی صدا
ایک بے تاب خواب کی آہٹ

پھر نیازیؔ ہوئی نشہ افروز
اک پرانی شراب کی آہٹ

یاسمن ہو، کہ نسترن ہے عبث
تو نہیں ہو تو یہ چمن ہے عبث

جو ترے ذکر سے سہر نہ اٹھے
روح بے کار ہے بدن ہے عبث

میں تری خوشبوؤں میں ڈوبا ہوں
مجھکو یہ نافۂ ختن ہے عبث

جان توڑے کبھی مری صورت
خود پہ نازاں یہ کوہکن ہے عبث

سوچتے ہو تو بولنا سیکھو
جب زباں ہی نہیں دہن ہے عبث

بات دل کی اگر بیاں ہی نہ ہو
پھر تو یہ شعر یہ سخن ہے عبث

فاعلاتن مفاعلن فعلن
شاعروں کے لئے یہ فن ہے عبث

میں ترا اور اس قدر محتاج
جیسے اعداد کا صفرؔ[اے] محتاج

میں ہی تنہا نہیں ترا سائل
گھر طلبگار، بام و در محتاج

تکتا رہتا ہوں راہ قاصد کی
مجھکو یوں، غیر کا نہ کر محتاج

حسنِ صیاد کے اسیر جو ہوں
وہ تو رکھکر بھی بال و پر محتاج

تیرے دل سے نکل کے ٹھہریں کہاں
پھرا کرتے ہیں دربدر محتاج

میں ہوں اس خوش خرام کو بے چین
جس کے قدموں کی رہگزر محتاج

اے جانے دیجئے

بیداری احساس کی مانگے روز خراج
میں سونا تسلیم جی، مٹی کا محتاج
صرف لبوں پر ہی نہیں خود داری کی بات
رکھتا بھی ہوں زیبِ سر کانٹوں کا یہ تاج
اس نے پوچھا حالِ دل میں نے دیا جواب
پرسوں سے بہتر تھا کل، کل سے بہتر آج
کنکر پتھر سے کہیں جیتی گئی ہے جنگ
''گن'' ہے تو محفوظ ہے وادی میں ''گنراج''
دونوں ایک مکان میں رہتے ہیں کب سے ساتھ
سنگ نیازی دردو غم، دل تسلیم زجاج

ہوجائے نہ غالب کہیں امکان پہ شک بھیج
جھوٹی ہی سہی دل کو تسلّی کی کمک بھیج
تنہائی کے جوزخم ہیں مرجھانے لگے ہیں
پھر کوئی نیا عذر باندازِ نمک بھیج
چھایا ہے تن و جان پہ سناٹا عجب سا
غم بھیج، الم بھیج، چبھن بھیج، کسک بھیج
دل ہے کہ ترا قصد بھی کرنے سے ہے عاری
ضد بھیج، جنوں بھیج، ہوس بھیج، للک بھیج
آنکھوں نے کئی روز سے کھایا نہیں کچھ بھی
دوچار عدد تارے اور اک مشت فلک بھیج
''مسکال'' سے ہی کام چلاتا ہوں میں اکثر
گل پھینکتے ڈرتا ہوں سو دیتا ہوں مہک بھیج

معلوم تھا کسے کہ تعلق کی ہلکی آنچ
اک روز بن کے اٹھے گی دشت وجبل کی آنچ

جاڑے کی سرد رات کا تیور بدل گیا
جس دم کہ حسنِ شعلہ بداماں کی چھلکی آنچ

میں عاجزِ جمود تھا، گرمِ ہوس ہوا
جس آن اس کے دودھیا سینے سے ڈھلکی آنچ

پگھلے گی اب ضرور مرے مسئلوں کی برف
اس بار آرہے ہیں وہ خود لیکے حل کی آنچ

رکھتی ہے شہرِ شعروسخن کی فضا کو گرم
میری غزل کی آنچ مری ہی غزل کی آنچ

ہوجائے سرد مہریٔ قسمت کا سدِّ باب
نازل ہو اے قسیمِ ازل گر اجل کی آنچ

تکمیلِ آرزو کو ہے مطلوب ایک عمر
تسلیم کیا کرے گی بھلا پل دو پل کی آنچ

پھولوں کے درمیاں نہ کبھی خوشبوؤں کے بیچ
یہ عمر بیت جائے ترے گیسوؤں کے پیچ

آنکھوں میں محوِ رقص رہیں گزری ساعتیں
کل رات صبح تک میں رہا جگنوؤں کے بیچ

شیریں رفاقتوں کا زمانہ گزر گیا
اک شخص مجھ کو چھوڑ گیا آنسوؤں کے بیچ

سینے میں جاگزیں تھا امنگوں کا اژدہام
جب آپ تھے مقیم مرے بازوؤں کے بیچ

حیرت زدہ ہیں تیر کمانیں ہیں دم بخود
اسطرح بھی گھرے نہ کوئی آہوؤں کے بیچ

ہوتا نہیں ہے مجھ پہ کسی زہر کا اثر
اک عمر سے مقیم ہوں میں بچھوؤں کے بیچ

کس نے لگائی آگ مرے گھر میں کیا پتا
چہرہ مگر اسی کا لگا تھا دھوؤں کے بیچ

کٹ جائیں خیریت سے مرے دن کسی طرح
میں جی سکوں خدا کرے تجھ بن کسی طرح

گو تجھکو بھول جانے میں خود کو ہی بھول جاؤں
اس درد سے نجات ہو ممکن کسی طرح

تو دور ہے تو دل پہ ہے قابض ترا خیال
جاتا نہیں ہے چھوڑ کے یہ جن کسی طرح

زخموں سے میرے کچھ ہی زیادہ ہیں اختراں
گننا تو تھا محال لئے گن کسی طرح

جلتا ہے عشق آتشِ شوقِ و صال میں
ہوتا نہیں ہے حسن معاون کسی طرح

چالیس ۴۰/ کے جگر میں بھی سترہ ۱۷/ کے خواب ہیں
یہ بات جان لے مرا ہم سن کسی طرح

اے دوست ذکرِ دولتِ عشق و وفا نہ کر
آئی کسی طرح سے گئی چھن کسی طرح

طفلِ خوابیدہ کے پہلو میں کھلونے کی طرح
میرا ہونا بھی ہے جیسے نہیں ہونے کی طرح

زندگی پیاس کا اک سلسلۂ بے سروپا
خواب ہونٹوں کو زبانوں سے بھگونے کی طرح

دہشتِ مرگ سے اڑتیں نہیں نیندیں میری
وہی سونا مرے نزدیک ہے سونے کی طرح

اب تو بارش میں بھی چڑھتا نہیں دل کا دریا
ایک مدت ہوئی روئے ہوئے رونے کی طرح

زیورِ حسن سے ہے جسم مزین تیرا
کہیں چاندی کی طرح ہے کہیں سونے کی طرح

عشق بھی اس سے زمانے سے بھی رشتہ تسلیم
دانۂ سبحہ بہ زنار پرونے کی طرح

دیکھے شفق جو اس کو تو پڑجائے پھیکا رخ
روشن ہے میری آنکھ میں جس جل پری کا رخ

رکھتا ہوں دل تو رہتا ہوں محوِ خیالِ یار
ہوگا جو تشنہ کام کرے گا ندی کا رخ

چھٹتا نہیں ہے ابرِ غمِ روزگار کا
عرصہ ہوا ہے دیکھے ہوئے چاندنی کا رخ

ہر واقعے کو وقت پہ ہونا ہے رونما
بدلو ہزار سلسلۂ زندگی کا رخ

پھروں بساطِ شب پہ جگر آزمارہے
فرزیں مری ہوس کا، تری دل کشی کا رخ

ناحق ہی بدگماں ہیں نیازؔی میاں زحل
زہرہ کو ہے پسند اگر مشتری کارخ

احساس کے سرہانے اے جذبوں کے دف نہ چیخ
سوئے ہیں آج ہی مرے اہلِ کہف[1] نہ چیخ

لفظوں سے تیری فکر ابھی آشنا نہیں
جب تک گہر نہ ہولیں درونِ صدف، نہ چیخ

تیرِ نگاہِ یار کو دل کی تمیز ہے
آنے دے اے رقیب اسے سوئے حدف نہ چیخ

خود کو ذرا سنبھال تو اے ابرِ بد کلام
وہ آرہے ہیں میری گلی کی طرف نہ چیخ

دیوانہ ہوگیا ہے نیازؔی کہ دیکھئے
آنکھوں میں خوں نہ اشک، دہن میں ہے کف نہ چیخ

---

[1] جانے دیجئے

کھوئے تو پھر وہ آئے نظر بیس سال بعد
پھلنے لگا وفا کا شجر بیس سال بعد

خطرہ تھا پہلے خود سے ابھی ہے جہاں سے خوف
باقی ہے اب بھی خوف و خطر بیس سال بعد

اے دل جو نذرِ گردشِ ایام ہوگئیں
ان حسرتوں کو یاد نہ کر بیس سال بعد

ننھا سا ایک خواب تھا، کچی سی اک ہوس
دکھتے ہیں کیسے جانِ جگر بیس سال بعد

بنگال کا ہے سحر تمسخر نہ کیجئے
مجھ پر کیا ہے اس نے اثر بیس سال بعد

اس حسنِ اتفاق کے قربان جایئے
ہم اس کو یاد آئے مگر بیس سال بعد

سوچو کہ تم ہو سولہ برس کی میں بیس کا
پھر سے کرو شروع سفر بیس سال بعد

پانی تو کجا مجھ پہ ہے امروز ہوا بند
ہے جرم کہ ماضی کی روایت کا ہوں پابند

ہوتا ہے تو ہوجائے مرا خونِ تمنّا
بیٹھے ہی رہیں آپ دریچے میں حنا بند

تم نے بھی اگر چھوڑ دی آئینہ پرستی
ہوجائے گی اس شہر میں تقلیدِ انا بند

صیاد کی راحت میں خلل ڈالتے رہیو
کیجو نہ کبھی سلسلۂ آہ و بکا بند

موسم ہوا بیدار تو نیند آگئی ان کو
تسلیم جی اب چلئے کہ میخانہ ہو ابند

دل کا وہ حال کہ اب رنگ نہ خوشبو موجود
اس خرابے میں مگر آج تلک تو موجود

دمِ رخصت مجھے اس طور سے للہ نہ دیکھ
تیری دزدیدہ نگاہی میں ہے جادو موجود

تیرے پیچھے میری آنکھوں کو میسر کیا ہے
چاند گردوں پہ نہ انگنائی میں جگنو موجود

ایک مدت پہ کوئی پوچھنے آیا ہے مزاج
آج ہوتے جو مری آنکھ میں آنسو موجود

سر وہ کیا سر کہ نہیں عشق کا سودا جس میں
دشت کیا دشت کہ جس جا نہیں آہو موجود

کوئی دولت کے تحت، کوئی سیاست کے تئیں
میرے اطراف ترا حلقۂ بازو موجود

دیکھا کہ وقت نے جو دکھایا سرِ محاذ
لشکر درونِ خانہ رعایا سرِ محاذ

ماتم شکست کا نہ کہیں فتح کی خوشی
اک خونچکاں سکوت ہے چھایا سرِ محاذ

تنہا ہی دشمنوں سے بنرد آزما رہا
کوئی مری مدد کو نہ آیا سرِ محاذ

اک سمت چشم وابرو ویک سمت جان و دل
یہ کیسا رن پڑا ہے خدا یا سرِ محاذ

میں تو مصالحت پہ بھی مائل بجنگ بھی
تو مجھکو انجمن میں بلا یا سرِ محاذ

اے کاش کوئی مجھ میں اترتا امید بھر

آواز دے رہا ہوں میں ہل من مزید بھر

مجھ کو غرض تھی اس سے دعا و سلام تک

اس کا خلوص تھا مرے خط کی رسید بھر

مدت کے بعد اس سے ملے بھی تو کیا ملے

طولِ شبِ وصال تھا گفت و شنید بھر

کاٹا گیا نہ مجھ سے سر اپنے ضمیر کا

مجھ میں بھی اس جہاں کی ہوس تھی یزید بھر

ہر آرزو تمام ہوئی اس کو دیکھ کر

سوکھے تھے میرے ہونٹ سمندر کی دید بھر

پیشکش ہو قبول کرنے بھر

خود کو بو اس کو پھول کرنے بھر

عشق میں احتیاط ہے قائم

ایک اچھی سی بھول کرنے بھر

زندگی اس سے مانگ کر دریا

قطرہ قطرہ وصول کرنے بھر

ہم تو احباب سے نبھائیں گے

خامشی کو اصول کرنے بھر

دشمنوں سے ہے آپکا رشتہ

بس مجھی کو ملول کرنے بھر

مے کشی اب کہاں، مگر یونہی

کبھی کارِ فضول کرنے بھر

کام لیتے ہیں شاعری سے ہم

جرم اپنا قبول کرنے بھر

قتل ہونے سے ہے کب مجھ کو مفر، کر
اپنے دامن کو مرے خون سے تر کر

مجھ سے چھپتا ہے حقیقت کی طرح کیوں
تو ہے جادو تو کبھی مجھ پہ اثر کر

آندھیاں راہ نمائی پہ ہیں مامور
اے مسافر کبھی ایسے میں سفر کر

جب جھپکنے لگیں امید کی آنکھیں
آئینہ توڑ دیا اس نے سنور کر

رحم دل ہے بڑا صیاد ، پرندو
چھوڑ دیتا ہے پروبال کتر کر

کھڑی ہے مصلحت دیوار ہوکر
یہاں کیا فائدہ بیدار ہوکر

ٹھہر اے کاروانِ خوش گمانی
ابھی آتا ہوں میں تیار ہوکر

ملے گی اب تمہیں بھی سرفرازی
مجھی سے بر سرِ پیکار ہوکر

مجھی سے مشتہر ہوگی کسی دن
تمہاری گفتگو اشعار ہوکر

زباں تک ہے تو خوداری ہے قائم
اتر جائے گی یہ دستار ہوکر

امیدیں بابری مسجد کی صورت
کھڑی ہیں آج بھی مسمار ہوکر

تجھے بھی آگیا جینا نیازی
کسی کا حاشیہ بردار ہوکر

تسلیم نیازی لھو شعر

موسم ہے شہد بار مگر دل جلوں سے دور
بارش تو ہو رہی ہے مگر کونپلوں سے دور

ہم چونکتے نہیں کسی آہٹ پہ آج کل
رہتے ہیں حوصلوں سے الگ ولولوں سے دور

دیتے ہیں اپنے خوں میں نہا کر تمہیں دعا
جاؤ تمہارے پاؤں رہیں آبلوں سے دور

ہم کیا بگاڑتے ہیں تمہارا اے کرگسو
ہم مور ہیں ہمیں نہ کرو جنگلوں سے دور

ہر راستہ ہے میرا اندھیروں سے ہمکنار
رہتے ہیں میرے ہاتھ تری مشعلوں سے دور

افلاس کا پہاڑ، غموں و یاس کا پہاڑ
کاٹے کٹے نہ شدتِ احساس کا پہاڑ

زنجیر پاؤں میں ہے غمِ روزگار کی
سر پر میں ڈھورہا ہوں تری آس کا پہاڑ

منزل سے دور ہے یہ مرا آخری پڑاؤ
حائل ابھی ہے راہ میں انفاس کا پہاڑ

اک جنس ہے سکوں جو میسر نہیں اسے
حاصل ہے ورنہ فرد کو اجناس کا پہاڑ

اتنے قریب رہ کے بھی تلقینِ صبرو ضبط
گھوڑے کے سامنے نہ رکھو گھاس کا پہاڑ

دیکھا ہے میں نے خطۂ ارضِ بدن ترا
سونے کی کان ہے کہیں الماس کا پہاڑ

پھیلا ہوا ہوں جال کی صورت مگر ہنوز
مطلوب ہے مجھے تری غفلت مگر ہنوز

اکثر میں کاٹ لیتا ہوں سچ بول کر زباں
مجھ میں ہے بچنے کی جبلت مگر ہنوز

پیتا ہے روز میرے سبو کی بچی شراب
رکھتا ہے شیخ مجھ سے عداوت مگر ہنوز

ہم کو حضور عضوِ معطل نہ جانئے
ہے آپ کو ہماری ضرورت مگر ہنوز

تسلیم اس کے آنے کی ساعت کہاں رہی
جاری ہے انتظار کی بدعت مگر ہنوز

ان کو جو حق بیان سپاہی سے ہے گریز
مجھکو بھی ایسے ظلِّ الٰہی سے ہے گریز

دیوانِ خاص تک تو رسائی ہے آپ کی
مجھکو تو مے سے مرغ سے، ماہی سے ہے گریز

اس بو الہوس سے آج ہے میرا مقابلہ
راہِ وفا میں جس کو تباہی سے ہے گریز

کرتے ہیں عشق اور ہے رسوائیوں کا خوف
کاجل کا شوق اور سیاہی سے ہے گریز

میں بھی اب اسکے واسطے سینہ سپر نہیں
اس کو بھی میری پشت پناہی سے ہے گریز

ہر شخص کر رہا ہے تمہارا ہی انتظار
کس کو تمہاری چشم براہی سے ہے گریز

زندگی ہوگئی اسیری بس
بس اے انجام باضمیری بس
چشمہ چشمہ سر شک افشانی
قطرقطرہ اثر پذیری بس
دل کو مطلوب خلعتِ شاہی
جسم کو خرقۂ فقیری بس
جھیل لی ہم نے ہر بلائے حیات
رہ گئی ہے تو ایک پیری بس
خود گراتا ہے خود سنبھالتا ہے
دیکھ لی تیری دستگیری ،بس

نہ جگنوؤں کی تمنا نہ تتلیوں کی ہوس
ملے جو تجھ سے وہی میری مٹھیوں کی ہوس
کئی دنوں سے ہے محراب و در پہ خاموشی
فضا میں گونجتی پھرتی ہے آندھیوں کی ہوس
نشاط و کیف کا موسم گزر چکا ہے مگر
ہتھیلیوں میں تو زندہ ہے مہندیوں کی ہوس
طبیعتوں کو تن آسانیاں نہیں بھاتیں
نشیمنوں کو ہے مدت سے بجلیوں کی ہوس
ہم ایسے یاس زدہ درد وغم کے ماروں کو
نہ طائروں کی توقع نہ ہاتھیوں کی ہوس

کس پہ برسوگی گھٹاؤ مجھ پہ چھا کر العطش
کون ہے پیا سا یہاں میرے برابر العطش

سب کو منزل کی بشارت مجھ کو بس اذنِ سفر
سب کی قسمت آبجو میرا مقدر العطش

اس نے پوچھا حالِ دل میں اور کیا دیتا جواب
نامہ بر کو دے دیا اک لفظ لکھ کر العطش

قطرہ قطرہ التفات اور دریا دریا اشتہار
اس تسلی سے بہر صورت ہے بہتر العطش

آدمی کو پیاس بھی کس کس طرح کرتی ہے خوار
جس کے قبضے میں ندی اس کے لبوں پر العطش

آفات کا خلوص ، بلیات کا خلوص
اس کچے گھر پہ دیکھئے برسات کا خلوص

اچھی نہیں دروغ بیانی مگر حضور
ہوتا نہیں جواب ہر اک بات کا خلوص

دامِ فریبِ روشنیٔ طبع سے پناہ
سویا ہوں اوڑھ کر میں سیہ رات کا خلوص

دل مانگتے ہیں وہ بھی رقیبوں کے سامنے
دیکھا ہے ہم نے آپکے جذبات کا خلوص

بھائی یہ جنسِ کوچہ و بازار ہے نہیں
میری غزل میں ہے مری ہی ذات کا خلوص

ق

رکھتا نہیں ریا کا طبیعت میں شائبہ
اس ہاتھ سے چھپا تا ہے اس ہات کا خلوص

مجھ جیسے اک حقیر سے دیوان کی امید
شامل ہے اس میں اک دلِ سادات کا خلوص

مجھے گماں سے غرض ہے نہ اب یقیں سے غرض
تو جس مقام پہ موجود ہو وہیں سے غرض

مجھے شراب سے مطلب نہ جام کی حاجب
مرے نشے کو تری چشمِ احمریں سے غرض

ہمیں کسی نہ کسی سے تو قتل ہونا ہے
لہو کو کیوں ہو کسی خاص آستیں سے غرض

کس کا ہے تو غموں کا ہمیں سے ہے رشتہ
کسی سے ہے تو بلاؤں کو ہے ہمیں سے غرض

کہاں ملے گی تری برقِ خود نما کو اماں
کہ تجھ فلک کو تو پڑنی ہے مجھ زمیں سے غرض

میں خم کروں سرِ تسلیم شوق سے لیکن
اس آستاں پہ جسے ہو مری جبیں سے غرض

لہو ہوس کا رگوں میں لگا ہے جمنے، غلط
بھلا دیا ہو اسے لمحہ بھر کو ہم نے غلط

بہت ستایا ہے اس کو مری انا نے عبث
بہت رلایا اسے مرے درد و غم نے غلط

ترے عتاب سے واقف نہ تھا خدا کی قسم
غلط کو بھول سے لکھا مرے قلم نے غلط

اگر میں اس پہ نہ مرتا تو میرا ہوتا کیا
بچا لیا ہے مجھے میرے اک قدم نے، غلط

خرِ نحیف کو شہناز کہہ نہیں سکتے
کہ ''چہرہ چہرہ'' سجایا ہے محترم نے غلط

اصولِ عشق مقدم کبھی حصولِ رزق
برا کیا کبھی دل نے کبھی شکم نے غلط

آتے کہاں سے شعر میں باغ و بہار لفظ
اک شخص کے لبوں سے لئے مستعار لفظ

اظہار پہ بضد جو نہ ہوتے تو ٹھیک تھا
افکار سے الجھ کے ہوئے تار تار لفظ

یہ اور بات تھی کہ لبوں پر سکوت تھا
پلکوں پہ اس کے ٹھہرے ہوئے تھے ہزار لفظ

برسوں کے بعد ان سے ملاقات جو ہوئی
یونہی نہیں ہوئے شترِ بے مہار لفظ

جس دم کہ دیکھتے ہیں مجھے مائل سخن
کرتے ہیں دست بستہ مرا انتظار لفظ

تسلیم ہو کے رہ گئے ننگِ غزل فضول
سر رکھکے زیرِ سنگِ درِ اشتہار لفظ

دل سے کریں شروع کہ جاں سے کریں شروع
حیران ہیں کہ بات کہاں سے کریں شروع

اس رشکِ طبع زاد کا لائیں کہاں سے رشک
مہتاب سے کہ کاہ کشاں سے کریں شروع

پوچھو ہو ہم سے قتل وہ کرتے ہیں کس طرح
تیرِ نظر کہ تیغِ زباں سے کریں شروع

سنتے ہیں ان کو چاہئے ہر روز ایک دل
میرے بھی دل ہے میرے یہاں سے کریں شروع

آہی گئے ہیں شیخ تو لازم ہے ان کا پاس
دورِ شراب آج اذاں سے کریں شروع

کبتک یونہی جلے گا مہہ و سال کا چراغ
آنسو کا، اضطراب کا، اشکال کا چراغ

شب بھر تمہارے ہجر میں جلتا ہوں کس طرح
پوچھو کہ ہے گواہ مرے حال کا چراغ

گر گفتگو سے دل کو منور نہ کر سکو
روشن ہی کر دیا کرو ''مسکال'' کا چراغ

میں بدنصیب دوں بھی تو کیا دوں بجز دعا
جلتا رہے سدا ترے اقبال کا چراغ

کل بھی تھا جلوہ بار فروزاں ہے آج بھی
اس ذہن و دل میں جادوئے بنگال کا چراغ

یہ کیا کہ ضو فشاں ہے حویلی میں آج کل
تسلیم تیرے گاؤں کے چوپال کا چراغ

موسموں کی سرد بینی اک طرف
میری چادر جھینی جھینی اک طرف

عشق کرتے ہیں تو پھر رکھ دیجئے
دال، چاول، تیل چینی اک طرف

میکشی سے اک طرف توبہ مری
اور اس کے ساتھ پینی اک طرف

جب بھی اس سے ملتے ہیں رکھ دیتے ہیں
ہم اٹھا کر بے یقینی اک طرف

کم نگاہی کا گلہ اپنی جگہ
اور اس کی دل نشینی اک طرف

خوشبوؤں کی بھیڑ میں تسلیم جی
اس کی خوشبو بھینی بھینی اک طرف

تو شہسوار مری دھول دھول سے واقف
میں رہگزر ترے ردّ و قبول سے واقف

ہمارے بیچ زمانے کا کوئی کام نہیں
میں تیرے عفو سے تو میری بھول سے واقف

تو میرے دل سے مرے اضطراب سے آگاہ
میں تیرے خوف سے تیرے اصول سے واقف

نہ ہجو سے میں ہراساں نہ مدح سے مسرور
میں اپنے ارض سے آگاہ طول سے واقف

تو ہی بڑھائے اگر آندھیوں سے رسم و راہ
تو ہی تو باغ کے ہر ایک پھول سے واقف

دن رات اس کے نام کو بھجنے کا اشتیاق
دنیا کو اسکی چاہ میں تجنے کا اشتیاق

جاتا نہیں ہے دل سے گو آتا نہیں ہے وہ
سجنا کے انتظار میں سجنے کا اشتیاق

ہوکر سپردِ خاک بھی مجھ سخت جان کو
دیوار پر اسی کے اپجنے کا اشتیاق

اللہ رے وہ رات کہ مضراب چوم کر
خود ساز نے کہا مجھے بجنے کا اشتیاق

دامن پسارئیے تو برستے نہیں کبھی
کچھ بادلوں کو یونہی گرجنے کا اشتیاق

رگڑی ہزار ہم نے نیازؔی زمیں سے ناک
واقف نہ ہو سکی کبھی بوئے یقیں سے ناک

سچ بولنے کے شوق نے دم ناک میں کیا
جی کر رہا ہے پونچھ لوں میں آستیں سے ناک

رکھ تو رہے ہو اس کی محبت کی دھار پر
یہ جان لو کہ دور نہیں ہے جبیں سے ناک

شاید تری ہوس کا ہے یہ نقطۂ کمال
ابھری کہیں سے آنکھ بدن پر کہیں سے ناک

افراطِ مرغ و ماہی میں وہ مجھ سے یوں ملے
جیسے کوئی سکوڑ لے نانِ جوئیں سے ناک

اِس کے ہر اک فراز سے لیکر نشیب تک
میں نے تو اُس کو سونپ دیا ہے نصیب تک

بیمار آپ ہی کا ہوں کچھ کیجئے حضور
حتیٰ کہ یہ معاملہ جائے طبیب تک

یوں کر کے میرے حال پہ اعلانِ التفات
رہنے دیا نہ آپ نے مجھکو غریب تک

دل سے نکل سکی نہ کسی پل تری ہوس
پہنچا نہ یہ اسیرِ ''غزہ'' ''تل ابیب'' تک

تسلیؔم ہم کہاں ہیں کہ ہر راہِ لطف و مہر
دستِ حبیب سے ہے دہانِ رقیب تک

اس پار - حدِ سلسلۂ سنگلاخ تک
جانا ہے ایک دل کے وسیع و فراخ تک

میں جانتا ہوں پھر بھی اگر پوچھ لوں کبھی
احباب کیسے خاک سے پہنچے ہیں کاخ تک

بیڑا کبھی امید کا ہوتا نہیں ہے غرق
میں نے تو کر کے دیکھ لیا ہے سوراخ تک

کرئے نہ ایسی بات کہ آئے اسے حیا
گل توڑئے نہ یوں کہ لچک جائے شاخ تک

تڑپا کیا میں بسملِ مسکین دیر تک
پڑھتے رہے وہ سورۂ یٰسین دیر تک

دیکھا جو میرا زخم تو گھبرا گئے حضور
دیتے رہے تسلیٔ نمکین دیر تک

کرتے ہو قتل مجھ کو مگر اتنا جان لو
رہنا پڑے گا تم کو بھی غمگین دیر تک

ظالم یہ وصل شب ہے شکایات پھر کبھی
رہتا نہیں ہے لمحۂ رنگین دیر تک

ہوتا بھی ہے قریب تو رہتا نہیں قریب
دیتی ہے اس کی یاد ہی تسکین دیر تک

یا دوش پر عذاب و غمِ جانکاہ رکھ
یا پھر لحاظِ سطوتِ عالم پناہ رکھ

پل بھر میں یوں نہ توڑ زمانے کا رابطہ
ہر گاہ گر قبول نہیں گاہ گاہ رکھ

آنکھوں سے آنسوؤں کا تعلق اٹوٹ ہے
ویران آسماں نہ رہے مہر و ماہ رکھ

جانے سے کون روک رہا ہے خوشی سے جا
پر اس طرح کہ لوٹ کر آنے کی راہ رکھ

جب آگ جل رہی ہو تو اٹھے نہ کیوں دھواں
سینے میں درد ہو تو لبوں پر بھی آہ رکھ

گھر بیٹھ کر گزاروں تو تنہائیوں میں آگ
باہر نکل پڑوں تو شناسائیوں میں آگ

اس کی خنک مزاجئ ظاہر پہ تو نہ جا
بیٹھی ہے چھپ کے جھیل کی گہرائیوں میں آگ

بچے دھوؤں کے دوش پہ بیٹھے اور اڑ گئے
اب کھیلتی ہے گاؤں کی انگنائیوں میں آگ

یا رب ہمارے پھول سے جسموں کی خیر ہو!
بٹنے لگی ہے آگ کے شیدائیوں میں آگ

یخ بستہ ہو چکی ہے تری وادئ حیات
نے پربتوں پہ آگ نہ اب کھائیوں میں آگ

رام ہم سب تجھی کو جانیں چل
توڑنی ہیں کئی کمانیں چل

سب کو الہام کی ضرورت ہے
کوئی سنتا نہیں اذانیں چل

غیر کے سیم و زر سے کیا لینا
اپنی گلیوں کی خاک چھانیں چل

آج موسم ہے آشیاں والا
آج رکھ ملتوی اڑانیں چل

آپ بیتی کوئی نہیں سنتا
لوگ سنتے ہیں داستانیں چل

دل خلوص و وفا سے خالی ہیں
بند کردی گئی ہیں کانیں چل

سبھی تو خود کو سمجھتے ہیں آشنائے غزل
سو کس کو ٹال دے کس کو گلے لگائے غزل

یہ مشغلہ بھی بڑا جانگداز ہے اے دوست
کہ لاکھ روؤ تو اک بار مسکرائے غزل

مرے خلوصِ تخیل کو چاہئے وہ کمال
کہ میں خموش رہوں مجھ کو گنگنائے غزل

میں اشتہار کا قائل نہیں ہوں ہم عصرو
ہے میری ذات ہی مقصودِ اشتہائے غزل

میں احتسابِ غمِ روز وشب میں ہوں مصروف
نہ میں رسولِ غزل ہوں نہ میں خدائے غزل

مجھ ایسے خاک نشینوں کی دل دہی کے لئے
کبھی تو میر کی چھت سے اتر کے آئے غزل

نکل کے دل سے یقیں کا سنپولیا تسلیم
کہاں گیا، ارے کس اور ہولیا تسلیم

کسی کا دامنِ بے داغ تر کیا نہ کبھی
بہت ہوا تو اکیلے میں رولیا تسلیم

بدن سوار تھی پچھلی کئی رتوں کی تھکن
کسی نے بانہہ بچھادی تو سولیا تسلیم

پھر ایک بار بھی پی لی شراب جس تس نے
اور آپ نے یونہی دامن بھگولیا تسلیم

کہ بزمِ ناز میں غیروں کا ذکر ہوتا رہا
تمہارا نام کسی نے کہو لیا تسلیم

زمیں کے واسطے قطبین جاناں
مری خاطر تمہارے نین جاناں

تمہارے دوجہاں تسخیر کرتا
اگر ہوتا میں ذوالقرنین جاناں

تمہاری یاد ہے شمشیر مجھکو
یونہی کٹتے نہیں دن رین جاناں

یہ کیسا ہفت خواں حائل ہے ابتک
تمہارے اور مرے مابین جاناں

"ق"

دریچے ہیں غریق سینہ کوبی
ہوائیں کر رہی ہیں بین جاناں

فروغِ روز و شب ماتم کناں ہے
میں تنہا ہی نہیں بے چین جاناں

مرے چاروں طرف یہ غم نمائی ہے
تمہارے ہجر کی ہے دین جاناں

تری ادا ہے مگر اتنی دل فریب کہاں
کہ بھول جاؤں میں دامن کہاں ہے جیب کہاں

میں چل رہا ہوں مگر آج بھی نہیں معلوم
کہاں فراز ہے اس راہ میں نشیب کہاں

ہوا قریب سے گزری تو لو مچلنے لگی
کسی کو دوستو ، اس حال میں شکیب کہاں

رہی نہ عمر ہماری تو جی کیا کہ جئیں
کہاں کا خواب ہوا آکے چشم زیب کہاں

مجھے پتہ ہے نیازؔی کہ شہر میں تیرے
کہاں خلوص ملے گا مجھے فریب کہاں

ایک گلشن ہے ایک بو ہے میاں
درد تو دل کی آبرو ہے میاں

رہے آباد اس کی جلوہ گری
پیاسی آنکھوں کو آبجو ہے میاں

ایک ہلچل مچی ہے سینے میں
جانے کس شئے کی آرزو ہے میاں

اپنا اسلوبِ شاعری کیا ہے
اس کا اندازِ گفتگو ہے میاں

ساری رعنائی چمن اس سے
ورنہ بادِ نسیم لو ہے میاں

ویسے کچھ بھی نہیں نیازی میں
وہ تو کہئے کہ جستجو ہے میاں

موجود ہوں تمام وسائل تو کیا کروں
میں خود ہوں اپنی راہ میں حائل تو کیا کروں

اس کا ہے انتظار جو آتا نہیں کبھی
شب بھر رہوں نہ خود میں حمائل تو کیا کروں

اک عمر پہ ملی ہے جو خیرات دید کی
دے دوں نہ اس پہ جان میں سائل تو کیا کروں

اٹھیں اگر زمیں سے تو بچنا بھی سہل ہو
اتریں جو آسماں سے مسائل تو کیا کروں

جاں اس پہ دوں نثار کہ دل سونپ دوں اسے
وہ ہو کسی طرح بھی نہ قائل تو کیا کروں

روٹھے تو ایک پل میں منالوں صنم کو میں
لیکن وہ بند کرلے مبائل تو کیا کروں

جو اس غزل دہن کو نیازیؔ نہ ہو پسند
کر دوں میں اس غزل کو نہ زائل تو کیا کروں

وہ سراپا ناز ہے غیروں کا داعی ان دنوں
مجھ پہ تو نافذ ہے حکمِ امتناعی ان دنوں

اب مرے دل کے زیاں کا کون رکھے گا خیال
وہ تو ہے مشغولِ کارِ انتفاعی ان دنوں

پاؤں مجبورِ نشیبِ روزگارِ زندگی
دل کی منزل اس کی سطحِ ارتفاعی ان دنوں

خواب آنکھوں سے زباں سے لفظ دل سے آرزو
سب اسیرِ ابتلائے انقطاعی ان دنوں

ساری تجدیدِ تعلق کی امیدیں مر چکیں
دل ہوا ہے جیسے قبرِ اجتماعی ان دنوں

انقلابِ گردشِ ایام دیکھا چاہیئے
ہم ہوئے تنگِ رعیت اور وہ راعی ان دنوں

کچھ اپنی بے بسی سے تو آگاہ میں بھی ہوں
انگور زندگی ہے تو روباہ میں بھی ہوں

کچھ خواب میں بھی دیکھتا رہتا ہوں صبح وشام
ان اجلے ہاتھیوں کی چراگاہ میں بھی ہوں

کب سے ہے انتظار کسی خوش خرام کا
مجھ سے بھی کوئی گزرے، گزرگاہ میں بھی ہوں

کچھ بھی نہیں پاس مگر اک انا تو ہے
اس اپنی مملکت کا شہنشاہ میں بھی ہوں

یارانِ خوش کلام ہیں کیوں مجھ سے بدگماں
حق گوئی گمرہی ہے تو گمراہ میں بھی ہوں

غم سے نجات پانے پہ اصرار اور یوں!
اپنے گلے پہ اپنی ہی تلوار اور یوں!

میں کچھ نہیں تو آپ کی کس سے ہے دشمنی
حضرت مرے وجود کا اقرار اور یوں

اپنوں کی بات غیروں کے آگے اور اسطرح؟
خلوت کا تذکرہ سرِ بازار اور یوں؟

پیتے ہیں ہم بھی شیخ، مگر آپ کی طرح
رکھ رکھ کے رہن جبہ و دستار اور یوں

ہم تو ہیں حسنِ یار کے اے چارہ گر اسیر
اس کی گلی میں آپ بھی لاچار اور یوں

پڑھتے ہیں اہلِ شعرو ادب ہو کے باوضو
تسلیم بھائی آپ کے اشعار اور یوں

بے چین کل تھے تم بھی سو کہنے میں شرم کیوں
روئے نہ رات بھر تو یہ آنکھوں پہ ورم[1] کیوں

کچھ جل رہا ہے دل کے نہاں خانے میں ضرور
ورنہ بدن تمہارا ہے اس درجہ گرم کیوں

یارب ترے جہاں میں ہے کیوں اس قدر تضاد
اس سنگ دل کے لب ہیں گلوں سے بھی نرم کیوں

مجھ کو ملا ہے شوق تو کیوں معترض ہیں آپ
کہئے کہ دی ہے آپ کو قدرت نے شرم کیوں

تسلیم تیرے شہرِ ستمگر میں آج کل
بازارِ التفات و عنایت ہے گرم کیوں

---

۱ ورم کے "ر" کی تسکین کے لئے معذرت

گوری اکیلی کیا گئی چھوڑ کے اپنا گاؤں
پنگھٹ سے پانی گیا اور پیپل سے چھاؤں

دھوپ کہو یا چاندی سارے اس کے غلام
کوئی اتارے آرتی، کوئی پکھارے پاؤں

فرقت میں اس شوخ کی چین ہے کس کا نام
دست درازی غم کرے، درد پسارے پاؤں

بوسہ جو مجھکو ملے، جل بھن جائے رقیب
بلی میرے یار کی مجھ پر کرے میاؤں

ختم نہ ہو شاید کبھی کلجگ کا بنباس
گئے تو اکیے رام جی لیکر گئے کھڑاؤں

کر رہی ہیں حکمرانی خواہشیں
آدمی مزدور رانی خواہشیں

حور کی آغوش میں دورِ شراب
اس جہاں میں آنجہانی خواہشیں

کچھ زمانے سے جڑیں کچھ آپ سے
کچھ یونہی، کچھ جانی مانی خواہشیں

آج آنکھوں سے اچانک گر پڑیں
کچھ پھٹی میلی پرانی خواہشیں

جستہ جستہ ہوگئیں آخر بیاں
میری غزلوں کی زبانی خواہشیں

بڑی امید سے تکتے ہیں سب تری آنکھیں
نہ جانے کس کو کریں منتخب تری آنکھیں

حیا سپاس ہیں اکثر تو چپ ہی رہتی ہیں
کبھی کبھار ہی ہوتی ہیں لب تری آنکھیں

چمن کی سیر سے بڑھ جائے ہے مری الجھن
بہار مجھ سے کرے ہے طلب تری آنکھیں

قسم ہے مجھکو جو میں نے شراب پی ہو کبھی
مرے لئے تو نشے کا سبب تری آنکھیں

قیام گاہِ جمالِ سحر ترے عارض
کلید ہائے درِ نسیم شب تری آنکھیں

سر پھوڑنے کا شوق مجھے کب رہا نہیں

مجھ کعبہ دل کو حیف کوئی ابرہا نہیں

مجھ کو بھی روبروئے رقیبانِ روسیاہ؟

تم کو لحاظِ اخرم و اخرب رہا نہیں

لیل و نہار میرے اور اس شخص کے بغیر!

تجھ سے حیات جا مجھے مطلب رہا نہیں

پرویز چشم ہوگئے اس بار آپ بھی

بستی میں کوئی تیشہ گرِ لب رہا نہیں

کرتے بھی کیا کہ ہم جو نہ ہوتے گریز پا

وہ بھی تو مست گامِ رہِ شب رہا نہیں

صحرا نوردِ فکر و تخیل ہوں اور بس

میں دستگیرِ عہدہ و منصب رہا نہیں

روؤ ہزار دیکھنے والا مگر نہیں

جلتے رہے چراغ اجالا مگر نہیں

اس کے قریب و دور پہ قبضہ تو ہے مرا

اس قطعۂ زمیں کا قبالا مگر نہیں

ہونٹوں سے آشکار ہے دل کی ہر ایک شئے

سب کچھ ہے اس مکان میں تالا مگر نہیں

میں گر پڑا تو دیکھ کے ہنسنے لگے سبھی

بڑھکر مجھے کسی نے سنبھالا مگر نہیں

میں تھا کہ دوستوں کے ستم جھیلتا رہا

تلوار کو میاں سے نکالا مگر نہیں

نیرنگئ حیات سے مجھ کو خدا بچائے

خوشیوں میں کیا مزہ غم و آلام گر نہیں

وہ آدمی بخیل بھی فیاض بھی نہیں
راضی نہیں کسی سے تو ناراض بھی نہیں

کوئی مرض جو ہے مجھے لاحق تو ایک عشق
ویسے میں کوئی پیکرِ امراض بھی نہیں

خود کو جو واردات سے پہلے سمیٹ لے
اتنا بڑا میں وقت کا بناض بھی نہیں

عاشق میں اس طرح کہ میسر نہیں وصال
خادم میں یوں کہ اجرت و اعواض بھی نہیں

ہوتا ہے کیا نگاہ سے یہ کام آجکل؟
گلچیں کے ہاتھ میں کوئی مقراض بھی نہیں

رہتے ہو ساتھ عالیجنابوں کے اور پھر
کہتے ہو تم کہ مقصد و اغراض بھی نہیں

ملنے میں عار ہے تو موبائل سے بھی گریز؟
امداد گر نہیں ہے تو اقراض بھی نہیں؟

نہا کے دیکھتے کپڑے بدل کے دیکھتے ہیں
چل آج ہم ترے سانچے میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

جس ایک رہ میں سنا ہے نہیں کوئی منزل
ہم ابکی بار اسی رہ پہ چل کے دیکھتے ہیں

اگر سوال ہے لازم جواب کی خاطر
تو اس کے سامنے ہم بھی مچل کے دیکھتے ہیں

تمہارے جیسے تو جلتے ہیں دیکھ کر ہم کو
ہمارے جیسے تم ایسوں پہ جل کے دیکھتے ہیں

تری نظر سے ہمیں گر کے اچھا لگتا ہے
ہم اس ڈھلان سے اکثر پھسل کے دیکھتے ہیں

تمہارا نام سنیں اور یہ ٹھہر جائیں
تمہیں تو آنکھ سے آنسو نکل کے دیکھتے ہیں

میں خوش گماں ہوں کہ احباب میری کیچڑ میں
لوازمات نیازیؔ کنول کے دیکھتے ہیں

آنکھیں جلتی ہیں، عد سے جلتے ہیں
سب کے سب اس کے قد سے جلتے ہیں

رشک کرتے ہیں ایک دوسرے پر
وہ جنوں، ہم خرد سے جلتے ہیں

ذکر کیا شیخ کے رویے کا
یہ تو ہر نیک وبد سے جلتے ہیں

کچھ چراغوں کو طاق حاصل ہے
کچھ ہوا کی مدد سے جلتے ہیں

گیلی لکڑی نہیں مگر پھر بھی
وہ بڑے ردو کد سے جلتے ہیں

صفر ہوتے ہیں جو انہی کے چراغ
روز جس تس عدد سے جلتے ہیں

بجھنے لگتے ہیں جب چراغ کبھی
کچھ زیادہ ہی حد سے جلتے ہیں

کیا مہکتے ہیں زخم رات گئے
داغ کیا شد و مد سے جلتے ہیں

کہ دردوغم، میں بتاؤں کہاں سے آرہے ہیں
یہ خوردونوش مجھے آسماں سے آرہے ہیں

کسی نے کان بھرے ہیں ضرور میرے خلاف
عدو کے تیر ہیں تیری کماں سے آرہے ہیں

ٹھہر اے گردشِ ایام، دم تو لینے دے
ابھی ابھی تو ہم اک امتحاں سے آرہے ہیں

قریب اس کے ہوئے بھی نہ تھے کہ دور ہوئے
جہاں گئے بھی نہ تھے ہم وہاں سے آرہے ہیں

غبار پہنے ہوئے ، گردباد اوڑھے ہوئے
کہاں گئے تھے نیازؔی کہاں سے آرہے ہیں

وہ اپنی زلفوں کو دیوار کر کے سو رہے ہیں
تمام شہر کو بیدار کر کے سو رہے ہیں

ستم شعار کو اب بھی نہیں ستم سے گریز
وہ اس نظام کو خودکار کر کے سو رہے ہیں

کہ چوبِ خشک وہ کہتے ہیں جس ہوس کو مری
اسی کے سامنے انگار کر کے سو رہے ہیں

ہمی ہیں ایک جو بے خوابیوں میں بھی ہیں خموش
سب اپنے درد کا اظہار کر کے سو رہے ہیں

نسیم ہو کہ صبا اور شام ہو کہ سحر
ہم ان سے خود کو سبکسار کر کے سو رہے ہیں

زمانہ کیا ہے کہ اکیلے تری نظر سے بھی دور
ترے خیال کو ہم غار کر کے سو رہے ہیں

یہ انجمن ہے اس کی، گلا پھاڑنے کا نئیں
سرکس میں ہو نہ حکم تو چنگھاڑنے کا نئیں

سائل میں تیرے مال کا ویسے نہیں مگر
بچ جائے تو زمین میں بھی گاڑنے کا نئیں

اچھا کیا جو سارے خطوں کو جلا دیا
لیکن کبھی بھی اس کا پتہ پھاڑنے کا نئیں

خلوت میں آگئے ہو تو لہجہ بدل گیا
محفل میں کہہ رہے تھے مجھے تاڑنے کا نئیں

مطلوب ہے بہار کو مٹی مری اُدھر
بنگال کہہ رہا ہے اِدھر چھاڑنے[1] کا نئیں

راہِ فرشتگاں میں ابھی بھیڑ بھاڑ ہے
دامن کو اے نیازؔی ابھی جھاڑنے کا نئیں

---

[1] چھاڑنا بنگلہ فعل بمعنی چھوڑنا

کتابوں میں نہ رکھنا سات رنگی تتلیاں بچو
جوانی میں یہی بن جائیں گی تکلیفِ جاں بچو

کھلونے چھوڑ کر کمرے میں بے ترتیب جاتے ہو
کہ جانے لوٹ کر آؤ نہ آؤ پھر یہاں بچو

اندھیری رات کی انگلی کو تھامے وقت سے پہلے
بڑوں کو چھوڑ کر سوتا چلے، لیکن کہاں بچو

سرکتی ہیں، بکھرتی ٹوٹتی رہتی ہیں یہ برسوں
نہیں آتیں چٹانوں میں یونہی گولائیاں بچو

جوانی میں تمہیں کیا وہ زمانہ یاد آتا ہے
خدا ہوتے تھے جب تم اور ہم کرّوبیاں بچو

تمہارے ہونٹوں پر ہیں چیختی خاموشیاں میری
مرے سینے میں ہیں گم صم تمہاری بولیاں بچو

تھوڑی بہت کسی کے لئے حب ضرور ہو
دل ہو اگر قطب تو یہاں دب ضرور ہو

اس شخص سے امیدِ تاسّف نہیں مگر
دیکھے مجھے تو اس کو تعجب ضرور ہو

پلکوں پہ جگنوؤں کا تقرر نہیں تو کیا
آنکھوں میں تیرگی سے تعصب ضرور ہو

بیدار ساعتوں میں کوئی خواب ہو کہ وہ
سونے کے آہوؤں کا تعاقب ضرور ہو

آمیزۂ وجودِ بشر میں وفا کے ساتھ
تھوڑا بہت ریا کا تناسب ضرور ہو

رختِ سفر میں روغنِ عزم ویقیں کے ساتھ
تسلیم بھائی، نانِ تذبذب ضرور ہو

اس رت میں اور کیا اگاؤ
آؤ شجرِ دعا اگاؤ

لازم ہے خودکشی سے بچنا
خواہش پہ التوا اگاؤ

سینے میں کچھ نہیں اگے گا
اس مٹی میں انا اگاؤ

موسم ہے بڑا ہی احتجاجی
ہونٹوں پہ کوئی صدا اگاؤ

پک پک کے چٹک رہا ہے گندم
دہقانو، اشتہا اگاؤ

میں خوب ادھر جنوں اگاؤں
تم خوب اُدھر ادا اگاؤ

کسی نے پی ہے تو کوئی یونہی ہے آسودہ
مرے علاوہ ہر اک آدمی ہے آسودہ

مری فغاں سے شکایت تری بجا لیکن
تری نگاہ میں کس کی ہنسی ہے آسودہ

مجھے تو ہونا پڑا زندگی سے شرمندہ
مگر یہ فاحشہ کس سے ہوئی ہے آسودہ

تجھے بھی مے کی کمی ہو کبھی، خدا نہ کرے
ترے نشے سے مری تشنگی ہے آسودہ

تو چکھ کے دیکھ تجسس میں آگہی کا مزہ
کہ جس کو پیاس لگی ہو وہی ہے آسودہ

ہر ایک شخص ہے بے جا ضرورتوں کا اسیر
تڑپ رہی ہے اخوت اخی ہے آسودہ

جمشید کے پیالے میں پی لے تو کیا مزہ
چھولیں نہ اس کے ہونٹ رسیلے تو کیا مزہ

رہ کر ترے قریب بھی حاصل نہ ہو نشاط
پتے بہار میں بھی ہوں پیلے تو کیا مزہ

تیشہ ہے ننگِ جذبۂ بے اختیارِ شوق
سینے سے پتھروں کو نہ چھیلے تو کیا مزہ

اس درجہ صبر وضبط کہ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ
زخموں کو بھی اگر کوئی سی لے تو کیا مزہ

عاشق ہوں گامزن ہوں اکیلا بکوئے دوست
ہمراہ لے کے جاؤں وسیلے تو کیا مزہ

یہ زندگی ہے منتِ ابلیس کی رہین
ہوکر فرشتہ تو اسے جی لے تو کیا مزہ

دعائے وصل مری تار تار ہی لوٹی
بجائے یار شبِ ہجرِ یار ہی لوٹی

کبھی بجھائے بجھے ہیں چراغِ زخمِ جگر
ہوا رفو کی سدا شرمسار ہی لوٹی

اس ایک شخص پہ جب بھی اٹھی خدا کی قسم
مری انگشتِ شہادت فگار ہی لوٹی

مفاہمت کے اگرچہ کھلے تھے دروازے
انا ہماری سرِ کارزار ہی لوٹی

ابھی ادھر سے کوئی خوش خرام گزرا ہے
کہ اس خرابۂ دل میں بہار ہی لوٹی

پتا نہیں کہ درِ نیم شب پہ بیتی کیا
نہ تم ہی آئے نہ میری پکار ہی لوٹی

جب رات گذر جانے کو آئی تو زباں دی
جو چیز کہ دینی تھی مجھے اس نے کہاں دی

یوں مجھ پہ ترے لطف کا ہے شہر میں چرچہ
گویا کہ کسی شمع نے پروانے پہ جاں دی

ہونٹوں کی منڈیروں پہ ہی رہنے دو ہنسی کو
بیٹھی ہے جو دم بھر کو بچاری تھکی ماندی

رنگ آپ کا محتاج مہک آپ کی مرہون
گل آپ کے خدام بہار آپ کی باندی

غزلیں مری منظور ہیں کچھ اہلِ نظر کو
ہر چند کہ درگاہِ تغزل کی ہیں راندی

بہت ہو چکی رازداری نیازی
سمندر ہے اندھا بھکاری نیازی

جو تھے آندھیوں کے پجاری نیازی
ہوئے ناظمِ لالہ زاری نیازی

یہاں اشک ریزی مؤثر نہیں ہے
یہاں سب ہیں آنکھوں سے عاری نیازی

میں اپنی نگاہوں میں ایسے رہا ہوں
کراچی میں جیسے بہاری نیازی

یتیمی لڑکپن پہ غالب رہی ہے
جوانی پہ بے روزگاری نیازی

مرے واسطے درد و غم لازمی ہے
تمہارے لئے اختیاری نیازی

آج پھر آنکھوں میں جل تھا خامشی
آج پھر شب بھر مسلسل خامشی

شہر کی شوریدگی سے دور چل
کیوں یہاں مرتی ہے پل پل خامشی

لب منڈیروں پر ہوا کچھ تیز ہے
تو مرے سینے میں ہی جل خامشی

جانے کس کی تھی صدائے دل شگاف
چھا گئی ہر سو مکمل خامشی

چھانتا ہے شور اب شہروں کی خاک
گاؤں میں چنتی ہے چاول خامشی

چاندنی، خوشبو، ہوا، فرصت، شراب
ایسے میں تسلیم مہمل خامشی

زباں لکھتی ہے آنکھوں کے منافی
منافق ہوگیا ہے یہ صحافی

مرا دل اس سے اب ملتا نہیں ہے
تو اس میں بات کیا ہے اختلافی

کرم پر آج آمادہ ہیں صاحب
یہ آخر کس ستم کی ہے تلافی

تعلق آنہ جائے اس ڈگر پر
جہاں اچھی لگے وعدہ خلافی

ادھر آؤ چمن کے بے قصورو!
چلو صیاد سے مانگیں معافی

فدایانِ غزل کی بھیڑ ہر سو
اور اس پہ میں بھی اک بارِ اضافی

ضیافت کے لئے جو آپ چاہیں
محبت کے لئے ہے چائے کافی

میں کس درجے کا ہوں میخوار یہ ہوجائے طے ساقی
وگرنہ آج سے تجھکو مبارک تیری مے ساقی

مری بادہ کشی کے معترف پیرِ طریقت ہیں
تو آخر یہ ترا پیرِ مغاں کیا چیز ہے ساقی

مری ناپختگی کو لگ گئی کس کی نظر جانے
نہ آتی ہے مجھے ہچکی، نہ اب ہوتی ہے قے ساقی

کہ تونے دیکھا ہے مجھ مبتلائے عشقِ جاناں کو
کبھی اک "شخص" کو ہوتے ہوئے دیکھا ہے "شئے" ساقی

کہ اب تو میکدے میں وہ بھی خود کو رند کہتے ہیں
جو اپنے جام میں غیروں کی مے پیتے ہیں اے ساقی

جلاؔلِ کاکوی سے اسطرح منسوب ہے کاکو
کہ جوں عالم میں حاتم سے ہوا مشہور طے ساقی

ایسی تو نہ تھی نقل وحمل مورومگس کی
غنچہ کوئی پھوٹا کہ قبا آب کی مسکی؟

اللہ قسم، بات جو ہوتی مرے بس کی
گردن نہ اڑا دیتا میں خود اپنی ہوس کی

رسوائیِ دوراں کا تماشہ ہے مری بار
ہوتی ہے مدارات تو ہر ناکس وکس کی

اچھا نہیں لگتا ہے زمانے میں کوئی اور
دیکھی ہے مرے پیش نے صورت ترے پس کی

میں نام نہ کر آتا اسی جانِ غزل کے
ملتی جو مجھے عمر سوا لاکھ برس کی

گلشن کی سیاست سے پرشیاں ہیں پرندے
کہتے ہیں کہ اچھی تھی صعوبت ہی قفس کی

لینی تھی نہیں سر جو بلا، لی کہ نہیں لی
رسوائی اظہارِ وفا لی کہ نہیں لی

کہتے ہو کہ دے دی ہے نہ دیکر بھی کوئی چیز
لے کر کبھی کہہ دے جو سوالی کہ نہیں لی

بس ایک جھلک جس کی ہے بیمار کو اکسیر
وہ فون سے پوچھے ہے، ''دوا لی کہ نہیں لی؟''

میں تیرے قبیلے سے نہیں ہو ں کہ اے ظالم
جاں لے کے قسم جھوٹ ہی کھالی کہ نہیں لی

سامانِ سفر تم نے تو چن چن کے لیا باندھ
کونے میں پڑی تھی جو دعا لی کہ نہیں لی

شام ہوتے ہی گھر گیا پانی
آگ سے میری ڈر گیا پانی

آج بھی پیاس کی کھلی نہ زباں
آج بھی بے خبر گیا پانی

گرچہ سر تک مرے نہیں پہنچا
ورنہ اوقات بھر گیا پانی

جس کی کشتی میں ہم نہیں بیٹھے
اس کی کشتی میں بھر گیا پانی

بیچ کا راستہ نہیں منظور
اب تو بس یہ کہ مرگ یا پانی

عمر کاٹی سراب کے پیچھے
اب تو پیاسا ہی مر گیا، پانی

اور کب تک تناؤ میں پانی
مجھکو لے لے بہاؤ میں پانی

کس کی آغوش واہوئی مجھ پر
کس نے ڈالا الاؤ میں پانی

کون ہے آشنا یہاں مجھ سے
کس نے دیکھا ہے ناؤ میں پانی

دور گھر سے مرے برستا ہے
تو بھی اس کے دباؤ میں پانی

آپ شعلہ فشاں رہیں تو رہیں
ہم تو اب بھی سبھاؤ میں پانی

ہم تو پیاسے تھے شرط مان گئے
اس نے رکھا تھا داؤ میں پانی

کشتیاں غیر کے تصرف میں
اور میرے بچاؤ میں پانی

خوں ٹپکنے کے دن گئے تسلیمؔ
ان دنوں گھاؤ گھاؤ میں پانی

کوشش تمام امن کی بے سود ہوگئی
مٹی ہی اپنے شہر کی بارود ہوگئی

کس درجہ پھیلتی تھی اندھیرے میں جستجو
جب روشنی میں آئی تو محدود ہوگئی

ہر راہ ایک جیسی ہے مجھ بدنصیب کو
جس پر میں چل پڑا وہی مسدود ہوگئی

شب بھر ہی مشت جلاتے رہے مجھے
سوزش مری تمہارے لئے عود ہوگئی

میری گریز پائی مرے حق میں جو بھی ہو
کچھ دوستوں کو منزلِ مقصود ہوگئی

آنکھوں سے غم کے پھوٹتے سوتے تو جانتے
ہم بھی کسی کے سامنے روتے تو جانتے

ناآشنا رہے بوئے زلفِ نشاط سے
ہم بھی جو اس کے دوش پہ سوتے تو جانتے

تم خوش نصیب ہو کہ نہ ہو کر بھی ہو میاں
ہو کر مری طرح جو نہ ہوتے تو جانتے

تم بھی جو ایک شام ہماری طرح کبھی
دامن کو بے پئے ہی بھگوتے تو جانتے

جاؤ ہمارے درد سے کیا واسطہ تمہیں
تم بھی کسی کو راہ میں کھوتے تو جانتے

ہر ایک گام پہ ملتے ہیں دستگیر مجھے
کبھی گرا کے تو دیکھے مرا ضمیر مجھے

کسی غزال نظر کو خبر نہیں نہ سہی
مری غزل تو سمجھنے لگی ہے میر مجھے

کس احتیاط سے وہ جنگ میں شریک ہوا
کماں تو دے دی غنیموں کو، اور تیر مجھے

میں اپنے عجز سے واقف نہ تھا خدا کی قسم
قفس کو کھو لکے اس نے کیا اسیر مجھے

پرانی بات ہے لیکن یہ بات ٹھیک نہیں
نوازشیں تو ہوں اوروں پہ دار و گیر مجھے

جتنا رکھ پائے تو رکھکر مجھے واپس کردے
میں ترے ظرف سے باہر مجھے واپس کردے

یا مری طاقتِ پرواز کی تضحیک نہ کر
یا اے صیاد مرے پر مجھے واپس کردے

اے غمِ گردشِ ایام مرے خواب ہیں یہ
ارے سیلاب، مرا گھر مجھے واپس کر دے

آ گہی سے کوئی کہیو کہ ستم مجھ پہ نہ ڈھائے
تیرگی ہے مری چادر مجھے واپس کر دے

ترے رستے میں بچھی ہیں مری آنکھیں کب سے
مے نہیں دینی تو ساغر مجھے واپس کر دے

سارے منظر ہیں دھندزائیدے
تو ہے منزل تو اب دکھائی دے

درد بھی، خواب بھی دعائیں بھی
دے رہا ہے تو پائی پائی دے

اس قدر چھوڑ دے مجھے کہ خدا
اس کی آوازِ پاسنائی دے

ایک دل اور اسقدر احساس
اس عمل سے مجھے رہائی دے

شق ہوا جاتا ہے مرا سینہ
اب مجھے اذنِ لب کشائی دے

میں ترے عشق سے ہوا مغلوب
مجھکو اس بات کی بدھائی دے

شعر کہتے ہو تم، خدا تم کو
تھوڑا وصفِ سخن سرائی دے

بھیگے بھیگے ہیں بام و در سارے
دور رہ کر نہ اتنا تر سارے

کوئی تجھ سا ہو یا جہاں جیسا
مری حالت سے بے خبر سارے

تیرا ہونا جہان کا ہونا
تو جدھر ہو مجھے ادھر سارے

شور دن کا کہ شب کا سناٹا
تجھ خدا کے پیامبر سارے

دل کی چھت ہو کہ آنکھ کا زینہ
تجھ مسافر کی رہگزر سارے

میں ترے شہر میں کسے منظور
یاں تو رہتے ہیں کم نظر سارے

کون اس جا خدا نہیں تسلیم
اپنی اپنی بساط بھر سارے

کراہت اس قدر اور آہ خود سے
ہوا ناحق ہی میں آگاہ خود سے

انا خود کو خدا کہنے لگی ہے
بچا مجھکو مرے اللہ خودسے

ہماری آسماں چشمی تو دیکھو
چمک اٹھتے ہیں مہر و ماہ خودسے

ابھی موقوف ہے منزل رسائی
ابھی الجھی ہوئی ہے راہ خود سے

مری دیوانگی پہ ہنسنے والے
بڑھا کر دیکھ رسم و راہ خو د سے

پڑھوں گا عظمتوں کے وہ قصیدے
نکل آئیں گے عالی جاہ خود سے

تری آوازِ پا آئی کہاں سے
دمِ آخر دوا آئی کہاں سے

جنوں کو آج کس نے آزمایا
بیاباں میں صدا آئی کہاں سے

ان آنکھوں کے پیالوں میں نہ جانے
مئے دو آتشہ آئی کہاں سے

مرا دل اور اسے پانے کی خواہش
غبارے میں ہوا آئی کہاں سے

بری ہے مجھ خوئے خود ستائی
مگر یہ اے خدا آئی کہاں سے

نے اپنی بھوک سے نہ شکاری کے داؤ سے
مجبور ہیں ہم ایسے پرندے سبھاؤ سے

آنکھوں سے آنسوؤں کو جھٹکتے رہو مگر
جائیں گے صبح دم ہی مسافر پڑاؤ سے

ہم یوں ہوئے جوان کہ کاغذ کی کشتیاں
جیسے ہوں محوِ جنگ ندی کے بہاؤ سے

تو دستگیر ہے تو پس و پیش کا سبب
مجھ کو نکال میرے بدن کے الاؤ سے

اس نے نہیں ندی نے کیا تھا وفا کا عہد
مجھ سے نہیں کنارے بندھی ایک ناؤ سے

لازمی ہے ایک شے اور اختیاری اور شے
فاقہ مستی اور شے ہے روزہ داری اور شے

زہد ہے ان کی طبیعت عشق ہے فطرت مری
وضع داری اور شے ہے جاں نثاری اور شے

تم بھی اس کے ہمنوا ہو ہم بھی اس کے ہمنوا
جی حضوری اور شے ہے خاکساری اور شے

مل گئے تو پوچھ لیتے ہو زبانی خیریت
خیر خواہی اور شے ہے غم گساری اور شے

وہ مرے حالات سے غافل نیازیؔ ہے تو ہے
آہ وزاری اور شے ہے بردباری اور شے

سہنے سے باز آئے شکاری کے چوچلے
اب ذبح وہ کرے کہ پر وبال نوچ لے

لینا ہو ان سے کام تو پہلے بصد نیاز
ماتھے پہ چوٹ، ریڑھ کے جوڑوں میں موچ لے

مجھ سے الجھ رہی ہے خوشی سے الجھ مگر
اے گردشِ جہاں تو پھر اک بار سوچ لے

دو پل کبھی سکون سے رہنے نہ دے کوئی
وہ چھوڑ دے مجھے تو زمانہ دبوچ لے

دستک یہ کس کے در پہ دئے جا رہے ہیں ہم
تو بھی اگر نہیں تو یہ ہم کس کے ہو چلے

سورج نظر سے دل کی نمی کو چھپایئے
بس کیجئے کہ اب تو ستارے بھی سوچلے

بہلائے نہ بہلیں گے ہم اس بار جو مچلے
اس بار اگر شور بھی مچتا ہے تو مچلے

جاں لیتا نہیں قید میں صیاد کسی کی
کہتا ہے قفس کھول کے "بچ پائے تو بچ لے!"

چھپتا ہے کسی طور زمانے سے غمِ دوست؟
زخموں کو کوئی سی لے کہ داغوں کو کھرچ لے

سینے میں ابھی دھوم مچائیں گے لہو شعر
درد اس کا ذرا معدۂ احساس میں پچ لے

بے مایگیٔ وقت سے تنگ آ کے نیازیؔ
تھوڑا سا تو ہے ہی کہیں وہ بھی نہ خرچ لے

اہلِ دنیا کو شان و شوکت نے
مجھکو اک شخص کی محبت نے

خوب برسات کی ضیافت کی
میری دیوار پر تری چھت نے

مجھکو اقدام پر کیا مجبور
تیری باقاعدہ اجازت نے

مجھکو کتنا ذلیل و خوار کیا
میری سچ بولنے کی عادت نے

اس کی فرقت میں کس نے ساتھ دیا
دوشِ مے نے نہ دستِ وحشت نے

دل نے کیا کیا نہیں کیا ایجاد
سب کو ٹھکرا دیا ضرورت نے

اس فرطِ مسرت میں کہ جاں مانگی کسی نے
دیوانے ہوئے ایسے کہ ہم تو لگے جینے

ارماں ہیں کہ عہدِ متوسط کے مسلماں
اترے جو ترے پاس جلا ڈالے سفینے

میں عمر میں اپنی انہیں شامل نہیں کرتا
بیتے جو ترے ہجر میں دن اور مہینے

کچھ خوابِ گراں اف مری پلکوں پہ ہیں قابض
مرتے بھی نہیں ہیں کہیں جاکر یہ کمینے

غل کرنے سے روکو نہ اسیرانِ قفس کو
رکھیں گے زباں بند تو پھٹ جائیں گے سینے

تم خود ہی چلے آؤ کہ مجھ کو ہی بلالو
تنہا نہیں طے ہوتے شب و روز کے زینے

کرتے ہیں ہر اک بات کا دشنام سے آغاز
وہ مجھ کو سکھاتے ہیں تکلم کے قرینے

اپنے ہی چہرے سے گھبرا کر توڑ رہے ہیں آئینے
ہم کو یہ کس منزل پر لاکر چھوڑ دیا تنہائی نے

کل شب اس کی یاد بھلا کر جشن منا کر دیکھ لیا
نقاروں نے سینہ پیٹا بین کیا شہنائی نے

اس کی انگوری قربت سے کس نے مجھے رکھا محروم
کچھ تو مری کوتاہیٔ قد نے کچھ اسکی اونچائی نے

خاموشی کی نوکِ قلم سے دل کے دعوت نامے پر
شام ڈھلی تو صاد بنایا خوب تری انگڑائی

دستک تو اس نے ہی دی تھی داخل کوئی اور ہوا
دروازے کی ناسمجھی تھی دکھ جھیلے انگنائی نے

انا کے آئینہ خانے سے ڈرتا ہے
وہ اپنے سامنے آنے سے ڈرتا ہے

اسے آتا ہے پھولوں کی طرح کھلنا
مگر وہ کِھل کے مرجھانے سے ڈرتا ہے

قضا ہے کیا، مگر ہر شخص جانے کیوں
جہاں کا ہے وہیں جانے سے ڈرتا ہے

دل اس سے دور جانے پر تو ہے راضی
مگر یہ لوٹ کر آنے سے ڈرتا ہے

مجھے اس شہر میں سب پیار کرتے ہیں
مگر ہر شخص دیوانے سے ڈرتا ہے

طبیعت جرم پر آتی نہیں تسلیم
وگرنہ کون جرمانے سے ڈرتا ہے

وہ چاند جیسا نہیں دل جسے تلاشتا ہے
کہ چاند واند تو اس شخص کا گماشتہ ہے

ہمیں تو وقت نے اس کی طرف اچھال دیا
ہمارے سنگ سے دیکھیں وہ کیا تراشتا ہے

ہر آدمی ہے گرفتارِ گیسوئے دنیا
کسی کو عقد شدہ ہے، کسی کو داشتہ ہے

وفا کی بھوک اگر جان سے مٹے تو مٹے
دل ایسی چیز تو اس کاہنہ کا ناشتہ ہے

تجھی کو دوست کہا ہے سو ہے جہاں دشمن
یہ خارزار تو خودرو نہیں ہے کاشتہ ہے

دل اس کا طلبگار نہیں ہوتا ہے
یہ واقعہ زہنار نہیں ہوتا ہے
دیکھا ہے کہ بے چین وہ میری صورت
سچائی سے انکار نہیں، ہوتا ہے
میرے لئے کچھ نہ کچھ تو اس کے دل میں
جس امر کا اظہار نہیں ہوتا، ہے
آتی ہے جسے حیف خوشامد کی زباں
وہ میری طرح خوار نہیں ہوتا ہے
دکھ درد کے ماسوا رہِ عشق میں کچھ
نادان خبر دار، نہیں ہوتا ہے
تسلیم کبھی اس پہ قدم رکھتے نہیں
جو راستہ دشوار نہیں ہوتا ہے

وہ جو دوڑ سکتا ہے
راستے میں بیٹھا ہے
بوند بوند اڈتا ہے
دل بھی کیسا دریا ہے
خود سے بھی جو چھپتا ہے
میں نے اس کو دیکھا ہے
وہ جو ایک چہرہ ہے
شاعری سے اچھا ہے
وہ جو ایک چشمہ ہے
کون اس کو پیتا ہے
رات بھر کا رستہ ہے
اور گھپ اندھیرا ہے

دنیا سے تو ہر جنگ میں وہ ہارا ہوا ہے
اپنے ہی خلاف آج محاذ آرا ہوا ہے

قدموں کو تو اک گام بھی چلنا نہیں منظور
دل راہروِ ثابت و سیارہ ہوا ہے

افسوس اے دریوزہ گرِ خواہشِ دنیا
میں نے تو کسی پر دل و جاں وارا ہوا ہے

دل بھول گیا راحتِ ایامِ نشیمن
تجھ سے ہوا آزاد تو آوارہ ہوا ہے

مرنے پہ وہ آمادہ نہ جینے کو ہی تیار
بے چارہ، کس انداز سے بے چارہ ہوا ہے

جب سے اس چشمِ نشہ گر کا ارادہ ہوا ہے
لقمۂ نانِ جوئیں جرعۂ بادہ ہوا ہے

ہم بھی اب ہوگئے ہیں واقفِ آدابِ سفر
اس کی منزل ہوئی ہے اور مرا جادہ ہوا ہے

چھوڑ دے فکرِ زمانہ جو مجھے آج کی شب
حسنِ پرکار بمشکل ابھی سادہ ہوا ہے

دل کو اس خاکِ بدن پر ترس آتا ہی نہیں
اک جواں درد کا پیری میں اعادہ ہوا ہے

سرد اسلوبیٔ اظہارِ تاسف کی قسم
تجھ کو بتلا کے تو غم اور زیادہ ہوا ہے

میرے فرزینِ ہوس کا تو ہے قصہ ہی عجب
جب بھی پہنچا ہے ترے گھر میں پیادہ ہوا ہے

بے لباسیٔ تخیل میں غنیمت ہے غزل
ایک اک حرف بُنا ہے تو لبادہ ہوا ہے

تعطل پر تعطل ہو رہا ہے
چراغ اب صبر کا گل ہو رہا ہے

دوا لے کر جسے آنا تھا افسوس
وہ اب آیا ہے جب قل ہو رہا ہے

بپا ہے باغ میں شورِ سیاست
قفس میں کا ہے کا غل ہو رہا ہے

چنے جانے کے قابل ہی نہیں میں
کہ گل چیں سے تغافل ہو رہا ہے

مجھے بھی اس نے بھیجی ہے محبت
مرے دریا پہ بھی پل ہو رہا ہے

مری منقار کی ہے آزمائش
سنا ہے آج وہ گل ہو رہا ہے

کہ میں تو اس پہ پاگل ہو رہا ہوں
جہاں کس گل پہ بلبل ہو رہا ہے

گلی گم صم ہے اور چوپال چپ ہے
ابھی اس گاؤں کا اقبال چپ ہے

لبوں پر چہچہتی ہے مسکراہٹ
مگر سینے میں اضمحلال چپ ہے

ترے نزدیک ہم ایسے ہیں گویا
پرندے بولتے ہیں جال چپ ہے

ہوا نے توڑ دی وحدت شجر کی
ثمر جس پر نہیں وہ ڈال چپ ہے

اگرچہ بول سکتا ہے نیازی
مگر کچھ سوچ کر تا حال چپ ہے

اکیلا ہوں کوئی بھائی نہیں ہے
تماشہ ہوں تماشائی نہیں ہے

فریب و مکر پر چلئے کہ اس پر
کوئی پربت کوئی کھائی نہیں ہے

دکھاوے کی گھٹا سے دور رہنا
برسنے کے لئے چھائی نہیں ہے

میں جھک جاتا ہوں اس کے در پہ آ کر
یہ چاہت ہے جبیں سائی نہیں ہے

وہ اک دشمن اور اتنا خوبصورت
مجھے احساسِ پسپائی نہیں ہے

شرارت سے ہے کب یہ باز آئی
طبیعت اس پہ کب آئی نہیں ہے

دل اکیلا رات سونی ہے تو ہے
آپ کو کیا، بے سکونی ہے تو ہے

دل کو خود داری کا صحرا ہے پسند
آپ کہتے ہیں جنونی ہے تو ہے

آپ نے تو کھینچ لی میری زباں
اب کہیں کچھ اندورنی ہے تو ہے

ہم نہ چھوڑیں گے پلٹ کر دیکھنا
ایسا کرنا بدشگونی ہے تو ہے

اس سے کیا کیا مانگئے اس عمر میں
اک تعلق ٹیلیفونی ہے تو ہے

ہے ہوس کا خون احیائے ضمیر
یوں اگر تسلیم خونی ہے تو ہے

ہوا چلی بھی نہیں شاخ کیوں لچک رہی ہے
مری نگاہ کس آفت کی راہ تک رہی ہے

تری رتوں کو ادب، تیرے جگنوؤں کو سلام
کہ اب تو تیرہ نصیبی کی فصل پک رہی ہے

دمِ وصال، شبِ برشگال کیا ہوگا
یہاں تو یوں ہے کہ شبنم سے چھت ٹپک رہی ہے

وہ بات کرتا ہے تو پھول اب نہیں جھڑتے
کہ اے ہوائے زمانہ، یہ کیا تو بک رہی ہے

وہ خوش خرام اور اے گردشِ جہاں مرے گھر
کہ میں نے پی ہے شراب اور تو بہک رہی ہے

نشے میں تو ہے مگر مجھ سا مست تھوڑی ہے
یہ فاصلہ کوئی دو ایک جست تھوڑی ہے

کسی کے عشق میں تھوڑا سا خود کو خوش رکھنا
خلافِ شرعِ غمِ بو دوہست تھوڑی ہے

کسی کا ڈوبتا ہونا اسے ہے وجہِ نشاط
تماش بیں ہے وہ موقع پرست تھوڑی ہے

یہ میرا دل ہے یہاں بیٹھتے ہیں دل والے
تمہاری کار کی پچھلی نشست تھوڑی ہے

تمہارے نام سے ہے تیس جنوری منسوب
تمہارے واسطے پندرہ اگست تھوڑی ہے

جہاں کا ہونا اور اس پر یہاں مرا ہونا
اک اتفاق ہے بس، بندوبست تھوڑی ہے

جلتے تھے جو چراغ وہ سب لو سے باز آئے
لازم ہے اب ہوا بھی تگ ودو سے باز آئے

سب جی رہے ہیں اس کی تمنا لئے ہوئے
کوئی تو اس بلائے سبک رو سے باز آئے

اِس کے تو اپنے حضرتِ واعظ ہیں مستحق
ہم ہیں فقیر ، پیرہنِ نو سے باز آئے

آتا ہے شاد رہنا ہمیں اپنے ''ایک''میں
ہم اے رئیسِ شہر ترے'' سو'' سے باز آئے

میں تابعِ رقیب کہ ہے درمیان تو
فرہاد کس طرح ترے خسرو سے باز آئے

بوسہ روا کسی پہ ،کسی پر ادا بھی بند
کوئی پئے شراب،کوئی جو سے باز آئے؟

ممکن ہے کوئی وجہِ تحیر نکل آئے
پھر شمر کے خیمے سے کوئی حر نکل آئے

تضحیک کبھی کرتے نہیں سنگ و خزف کی
کیا جانے کب ان سے ہی کوئی دُر نکل آئے

اک بھیگی ہوئی فاختہ بیٹھی جو سرِ طاق
اندر سے مرے سارے بہادر نکل آئے

کچھ روز سے میں اس کے بنا جینے لگا ہوں
اے کاش حقیقت یہ تصور نکل آئے

خط میں نہ کوئی متن ہی واضح نہ مطالب
اور اس پہ بضد میں کہ تاثر نکل آئے

اللہ کرے آپ بھی تڑپیں مری صورت
اور اس میں کوئی راہِ تواتر نکل آئے

اچھی نہیں تسلیم جی ، اتنی بھی شرافت
ایسا نہ ہو پنجوں کی جگہ کھر نکل آئے

کنجشکِ ہوس پھیل کے شہباز نہ ہوجائے
خاموشیٔ بے جا کہیں آواز نہ ہوجائے

معصومیٔ فطرت سے تغافل نہیں کرتے
گل پھینکنے والا شرر انداز نہ ہو جائے

دل شام سے ہی آپکے رستے میں بچھا ہے
کم بخت سے سرزد کوئی اعجاز نہ ہوجائے

شمشیر کھلی رکھتے ہیں کرتے بھی نہیں قتل
ڈرتے ہیں کہ بدبخت سرافراز نہ ہوجائے

ہوتی ہے شروعاتِ وفا بازیٔ جاں سے
جو شخص کہ اس راہ میں جانباز نہ ہو، جائے

ہم لاتے نہیں حرفِ شکایات زباں پر
ڈرتے ہیں طبیعت تری ناساز نہ ہوجائے

شمشیر نہ ہو پائے تو مہمیز نہ ہو جائے؟
کیا روئیں اگر اشک اثر خیز نہ ہوجائے!

کیا آئے مزہ ندرتِ تخئیل کو رم کا
رفتارِ زمانہ بھی اگر تیز نہ ہوجائے

مجھ بوریا والے کے یہاں آپ کا آنا
دل ان کی ضیافت کے لئے میز نہ ہوجائے

لِـــلّٰــــہ نہ کھولے کوئی دروازۂ زنداں
موسم کہ مجھے دیکھکے گلریز نہ ہوجائے

کرتا ہوں بیاں حالِ دلِ زار سنبھل کر
ڈرتا ہوں کہ ماحول غم انگیز نہ ہوجائے

تسلیم نیازی تری انگشت نمائی
یاروں کے لئے باعثِ پرہیز نہ ہوجائے

میرا وجود تیری سماعت کو کھل نہ جائے
ڈرتا ہوں منہ سے کچھ تری بابت نکل نہ جائے

اس کو خبر کرو کہ طبیعت کی آنچ پر
کب سے چڑھی ہوئی ہے قناعت ابل نہ جائے

جائے چلا وہ ہم سے مبادہ ملے بغیر
سر سے کہیں ہمارے قیامت یہ ٹل نہ جائے

تاریخ اس کے آنے کی پھر سے بدل گئی
تب تک مریضِ عشق کی حالت سنبھل نہ جائے

اربابِ حل و عقد ابھی سونے دیں ہمیں
ہم جاگ اٹھے تو ان کی حکومت بدل نہ جائے

دل سے متاع جستجوئے مستقل نہ جائے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں نیازی وہ مل نہ جائے

طاعت کا ہو قفس کہ گلستاں ہو کفر کا
اس کی گلی سے دور کہیں اور دل نہ جائے

اظہارِ عشق کا وہ تقاضہ نہ کیوں کرے
غنچہ جو ایک عمر سے غنچہ ہے کھل نہ جائے

اے دوست مجھ کو شوقِ نظارہ نہیں مگر
ڈر ہے کہ اس قبا سے بدن تیرا چھل نہ جائے

بولو ہو تم "ہمیں بھی محبت ہے" اور پھر
برتو ہو احتیاط کہ دل کیا ہے تِل نہ جائے

مٹھی بھر پہلے خواب رکھئے

پھر حدِّ نظر عذاب رکھئے

ہونٹوں پر ہے ہنسی ضروری

گلدانوں میں گلاب رکھئے

ان آنکھوں پر مرا بھی حق ہے

میرے لئے بھی شراب رکھئے

پڑھنے والوں کا کیا بھروسہ

ایسے نہ کھلی کتاب رکھئے

جانے کب حکم کوچ کا ہو

ڈھیلی ہی ابھی طناب رکھئے

ٹھنڈی نہ ہو آتشِ تعلق

تھوڑا بہت التہاب رکھئے

مقام بھول گئے میرا نام بھول گئے

کہ اب تو آپ سلام و پیام بھول گئے

ہمارے سامنے کرتے ہو ذکر مے اے شیخ

خطا معاف اگر احترام بھول گئے

مصالحت نہ تھی ممکن مگر دمِ آخر

وہ میری تیغ پہ اپنا نیام بھول گئے

بس اسقدر ہی کہ آغوش وا ہوئی اس کی

ہم اس کے بعد کا سارا نظام بھول گئے

ہزار رات کے بچھڑے ہوئے بدن آخر

ملے تو فاصلۂ صبح و شام بھول گئے

مصلحت پسند ہوگئے
وہ بھی درد مند ہوگئے

یوں گلی میں کس نے دی صدا
سب کواڑ بند ہوگئے

آپ اور ہمارے ہم نشیں
ہم تو ارجمند ہوگئے

جن پہ ایک بھی ثمر نہ تھا
وہ شجر بلند ہوگئے

جس گھڑی وہ آئے بام پر
فاصلے کمند ہوگئے

آپ ایک کیا ہوئے جدا
غم ہزار چند ہوگئے

جب تیز تھا بہاؤ تو بہہ تک نہیں گئے
ہم تجھ کو ڈھونڈنے تری تہہ تک نہیں گئے

بازی ہماری کوئی بھی فیصل نہ ہوسکی
مہرے گئے، مگر کبھی شہہ تک نہیں گئے

نالہ کبھی فرازِ جگر تک نہیں گیا
آنسو کبھی نشیبِ نگہہ تک نہیں گئے

آئے تو خیریت بھی نہ پوچھی مریض کی
جانے لگے تو ''بائے'' بھی کہہ تک نہیں گئے

ہم عمر بھر سفر میں رہے پھر بھی دیکھئے
منزل پہ وہ کھڑے ہیں جو رہ تک نہیں گئے

اپنے معاملوں سے خدا بھی رہا الگ
ہم بھی کسی عظیم گنہہ تک نہیں گئے

نیزوں کے رابطے میں رہے ہم تمام عمر
سینے کبھی ہمارے زرہ تک نہیں گئے

سینے میں ایک جذبِ پریشان کن لئے
میں نے تو اس کی راہ کے کانٹے بھی چن لئے

ہونٹون پہ بیٹھے بیٹھے کوئی نام آگیا
آنکھوں نے چپکے چپکے کئی خواب بن لئے

ہم کو تو اس سے ہجر کی چنگاریاں ملیں
موتی شبِ وصال کے غیروں نے چن لئے

اس سے مجھے جنون بھی غافل نہ کرسکا
صحرا میں بھی رہا اسے پانے کی دھن لئے

شعروں کے انتخاب نے رسوانہیں کیا
غفلت میں اس نے میرے سوالات سن لئے

نین آکاش تھے جو وا نہ ہوئے
اشک جو شبد تھے ادا نہ ہوئے

دل سے ہونٹوں تلک نہ آئے ہم
درد بن کر رہے، دُعا نہ ہوئے

خود پسندی کہو کہ خودداری
ہم کبھی آپ سے جدا نہ ہوئے

ہم تو بے کار ہی ہوئے رسوا
تم ہی اچھے جو آئینہ نہ ہوئے

زندگی بھر رہی ہوس اس کی
کبھی اس قید سے رہا نہ ہوئے

عمر بھر زیست کی شبانی کی
ہم مگر صاحبِ عصا نہ ہوئے

رموزِ شعر و سخن کا رمیز ہوتے ہوئے
میں عمر بھر رہا ناچیز، چیز ہوتے ہوئے

بٹھائے رکھا رقیبوں کے درمیاں مجھکو
وہ بد تمیز بڑا ہے تمیز ہوتے ہوئے

کسی کے طرزِ عمل کا مجھے ملال نہیں
بس اک خلش ہے کہ تم بھی، عزیز ہوتے ہوئے!

وہ بادشاہ مرا دل کہ شب گزارتا ہے
محل سے دور حرم میں کنیز ہوتے ہوئے

گئے ہیں غیر کے گھر کی طرف کئی رستے
کبھی مری بھی گلی سے، پلیز ہوتے ہوئے

تمہاری فکر نیازی جھلک ہی جاتی ہے
حروف و صوت کی چادر دبیز ہوتے ہوئے

متفرقات

تسلیم نیازی

نعتِ رسولِ پاکؐ

لبوں کو ذکرِ نبی، دل کو ہو خیال نصیب
مرے بھی زخم کو ہو جائے اندمال نصیب

بہشت رشک کریگی مرے نصیب پہ بھی
مجھے بھی ہوں گے مدینہ کے ماہ وسال نصیب

کبھی خدا کا مصاحب کبھی بشر کا شریک
کبھی جواب مقدر، کبھی سوال نصیب

مقام عرشِ بریں اور میزبان خدا
ہوا نہیں ہے کسی کو بھی یہ کمال نصیب

خدا کے بعد نہیں آپؐ کا کوئی ہمسر
نہ وہ خصال کسی کو نہ وہ جمال نصیب

نظام سیکڑوں لیکن نظامِ مصطفوی
وہ اکِ نظام کہ جس کو نہیں زوال نصیب

میں نعت کہلوں نیازؔی مری مجال کہاں
یہ امتحان تو ہوتا ہے خال خال نصیب

نعتِ رسولِ پاک

قدم کو عرشِ بریں، پشت کو چٹائی ہے
اے بادشاہ عجب آپؐ کی گدائی ہے

اسیرِ حبِّ محمدؐ ہوں میں خدا کی قسم
اسی میں خوفِ جہاں سے مجھے رہائی ہے

غبارِ راہِ مدینہ ہی ہوگیا ہوتا
کہ جس کی آج بھی افلاک تک رسائی ہے

نہ اشتراک ہی قائم نہ دائم استعمار
مگر جو راہ نبیؐ نے ہمیں دکھائی ہے

کہ نعت گوئی تو ہے سنتِ خدا تسلیمؔ
یہ کبریائی بشر نے وہیں سے پائی ہے

درمدحِ حضرت سید شاہ جلال الدین احمد کاکوی

(قصیدہ)

اے دل و جاں کے رہزن و قزاق
اے عروسِ بلادِ چست و چاق
اف وہ ایمان کش ادا تیری
ہوش کی چور ، عقل کی سراق
کچھ پیمبر تو کچھ ہوئے پاگل
دیکھ کر تیرا جلوۂ حرّاق
پھوٹا پڑتا ہے یوں شباب ترا
جیسے ساغر ہو مائل اہراق
تجھ میں ہنگامِ رنگ و بو ہر دم
وقتِ مغرب ہو یا دمِ اشراق
میری باتوں پہ کر یقین کہ میں
منہ نہیں کھولتا بجز اصداق

تجھ میں ہے موجِ زندگی موجود
پر کسی کی رہینِ استغراق
میں بتاؤں ، اسی کے زیرِ قدم
تو ہوئی مہر و ماہ کے مصداق
اس کے ہی خاکِ پا سے ہیں روشن
تیری ہر ہست و بود کے آفاق
تیری حالت تو اس کی غیبت میں
جیسے صدام کے بغیر عراق

(ق)

تو جو پابوس اس کی ہے تو رہ
میں منافق نہیں کروں جو نفاق
دور رکھے مجھے خدا شر سے
کوئی مجھ سے نہ ہو کبھی ناچاق

اس سے مطلوب ہے تجھے آتش
مجھ کو ملحوظ اس سے ہے چقماق
منتظر ہیں عطا کے ہم دونوں
تجھ کو معراج اور مجھے برّاق

(ق)

کس تنازعے میں پھنس گیا میں بھی
بھول کر صبر و ضبط کے اسباق
یخ زدہ ہوگئی فضا تسلیم
آ کہ روشن کریں غزل سے طِباق

غزل

وصل پر بھی ہو فصل کا اطلاق
زہر سے کم نہیں ہے یہ تریاق
سر میں سودا جو کر نہ دے بیدار
چاہیئے ایسی فصلِ گل سے طلاق

نا خلف ہے جہاں سو میں نے اِسے
کردیا اپنے ''کچھ نہیں'' سے عاق
کہہ دیا ہم نے جو بھی کہنا تھا
اب وہ کھوجا کریں سیاق و سباق
پیش دستی پہ ہے ہوس مائل
پاؤں دابوں کہ دیکھوں اس کی ساق
نہیں لیتے وہ میرا دل تو نہ لیں
شہر میں اور بھی تو ہیں اسواق

مطلعِ ثانی

آسماں کے چہار دہ اطباق
میرے خامہ کو ہوگئے اوراق
مدح مقصود ہے مجھے اس کی
خوش جہانی سے جس کا ہے میثاق

اس کی نسبت ہے شہر کاکو سے
جیسے حاتم کا طے سے ہے الحاق
نامِ نامی جلال ہے اس کا
معِ اِقبال اور مع الِاسباق
عقل و جذبات کا جواں جمہور
فکر و اظہار کا حسین وفاق
وہ سخاوت کہ ڈھونڈلے کوئی
اس سا دیوانہ ، اس کے جیسا مراق
وہ وجاہت کہ ہر زلیخا کو
رشکِ حسنِ نبیرۂ اسحاقؑ
اور وہ سطوت کہ سو عزیزِ مصر
ایک اس سے ہوں طالبِ اشفاق

(ق)

ناصیہ سا ہے شاعری اس کی
خود کو کہتا نہیں ہے گو خلاق
یونہی آتی نہیں دقیقہ رسی
کوٹ کر خود کو وہ ہوا دقاق
اس کی تحریر ہے کہ والقدوس
اس کی تقریر ہے کہ والرزاق
منفرد سب سے اس کا ذوقِ جمال
مختلف سب سے اس کا حسنِ مذاق
روبرو اس کے اشہرانِ شہر
کوئی حلّاج ہے کوئی حلّاق
شہرۂ اوج اس کا سن سن کے
ہے ثریا بھی دید کی مشتاق

(ق)

''تا نہ بخشد خدائے بخشندہ''

حسن والوں پہ اس کا استحقاق
دیکھ لیں اس کو جو پری زادے
چاہ لیں دفعتاً پروں سے فراق
گل فروشی کریں بتِ قتال
بوسے لہرائیں شہر کے شلّاق
حوّت سے ہو گریز پا زہرہ
اور لیلےٰ ہو قیس سے بے باق
اس کی تسلیم عشق آرائی
کیوں نہ گزرے ہوس شعاروں کو شاق
یہ نیازی کرم اسی کا ہے
میں جو ہوں میرِ مجلسِ عشاق

قطعۂ تاریخ وفات جلیل عشرت متوفی

رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ

ہے ہے رے اسپ گردشِ ایامِ بے زمام
لیتا ہے آدمی سے تو کس دن کا انتقام
ظالم خدا کرے کہ ترے ہاتھ ٹوٹ جائیں
اے رہزنِ اجل ہو جہنم ترا مقام
اک شخص انجمن میں ابھی تھا ابھی نہیں
جینا اسی کا نام ہے مرنا اسی کا نام
''اکیسویں صدی کا تھا گوتم رہا نہ وائے''
اس دہر میں کسی کو بھی حاصل نہیں دوام
ہستی تھی ایک شہرِ ادب میں جلیل قدر
اے آسماں ہمارے غموں کا کر احترام
اتنا بڑا ہے غم کہ برس دو برس ہیں کم
رونے کو چاہئے اسے اک عمرِ نا تمام

واسوخت

جاتا تھا کون چھی تری گلیوں میں تھوکنے
تجھکو کیا لذیذ تو بس میری بھوک نے

پیشہ نہیں ہے میرا محبت کا اشتہار
رسوا کیا ہے خود تجھے تیرے سلوک نے

معشوق کی نیاز سے بہتر ہے افتراق
یہ راز مجھ پہ کھولا ہے کوئل کی کوک نے

عاشق بدل رہا ہے تو جو صورتِ لباس
پھر جنسِ نو بہ نو سے لگا کیوں میں چوکنے

گھر کو ترے کیا ہے رقیبوں کی رقص گاہ
میری ہی بد دعا نے مرے دل کی ہوک نے

ریختی

ایسا نہ ہو کہ تیر نکل لے کمان سے
جلدی سے آ کے مل تو مرے بھائی جان سے

چڑیا تو چگ گئی مری کھیتی ہری بھری
اترے گا جانے کب وہ نگوڑا مچان سے

کب آئے گا بوا وہ مرا کانکن موا
سونا نکالنے مرے جوبن کی کان سے

کیا جانے منہ جلا مرے بوسے کا ذائقہ
فرصت تو اسکے منہ کو میسر ہو پان سے

اس مردوا سے رات کو پڑھنے گئی تھی میں؟
ہر بات اس کو کھولکے بولوں زبان سے؟

پیچھے تو کیوں پڑا ہے موا سامنے سے آ!
جوتی مری ڈرے ترے جیسے پٹھان سے

ریختی

پھیلی جہانِ دل میں یہ کیسی انار کی
کل رات اس نے چھوڑ دی رسی مہار کی

رن میں کبھی جو پیٹھ دکھاتا نہیں ہوا
میں راہ دیکھتی ہوں اسی شہسوار کی

گلیوں میں آتے جاتے وہ چھیڑے تو کیا کروں
تحصیل میں جو ہوں اسی تحصیلدار کی

گھر اس کے آگ لینے نہ جاؤں گی میں کبھی
نیت سمجھ گئی ہوں موئے ہوشیار کی

بھابھی کو ساتھ لے کے میں بیٹھی ہوں پارک میں
حد پار ہو رہی ہے ترے انتظار کی

بازار میں ضرور ہوں بازار کی نہیں
مجھ پر نہ ایسے ڈالو نظر ساہوکار کی

رباعیات

تسلیم نیازی

اردو

ڈھلتا ہے کہیں بادہ و ساغر اس کا
مرہوں ہے کوئی نان و نمک بھر اس کا
کھاتے ہیں سبھی حسب مقدر اس کا
ہم باندھتے ہیں پیٹ پہ پتھر اس کا

راحت کو نہ آرام کو روتا ہوں میں
شہرت کو نہ انعام کو روتا ہوں میں
جس کا دستِ ہنر ہے خیزاں مجھ میں
اس آذرِ گمنام کو روتا ہوں میں

ابا کے نام

دانے کو نہی آب کو روتا ہوں میں
عزت کو نہ القاب کو روتا ہوں میں
جس پر میں برگ برگ پھوٹا تھا کبھی
اس خاکِ فلک تاب کو روتا ہوں میں

اماں کے نام

روٹھے تو عزازیل کو شیطان کرے
راضی ہو تو آدم کو انسان کرے
تسلیم نیازی سے دیوانے کو بھی
گر چاہے تو وہ صاحبِ دیوان کرے

اپنے نام

خود ہی جو اکیلا ہے وفاق، آیا ہے
بستی میں بحسنِ اتفاق آیا ہے
سفاک ہواؤں کا زمانہ گزرا
آوارہ چراغو، چلو طاق آیا ہے

مخدومِ ادب عالی جناب سید جلال الدین احمد کاکوی کے نام

جب اس کی طلب مجھکو ستائے تو پیوں
وعدہ وہ کرے اور نہ آئے تو پیوں
میں ویسے شرابی نہیں تسلیم میاں
سب کچھ ہو مگر کچھ بھی نہ بھائے تو پیوں

جب گردشِ حالات پلائے تو پیوں
ہوجائیں مرے اپنے پرائے تو پیوں
للہ مجھے کوئی شرابی نہ کہے
وہ دیکھوں جو دیکھا بھی نہ جائے تو پیوں

جب کوئی مرا چین چرائے تو پیوں
جب دل میں کوئی آگ لگائے تو پیوں
اے دوستو، پینے کی طرح کون پئے
جب رات گئے نیند نہ آئے تو پیوں

تاریکی اکیلے میں ڈرائے تو پیوں
آسیب کا احساس دلائے تو پیوں
تسلیم شرابی نہیں میں، لیکن ہاں
سگ روئیں، ہوا شور مچائے تو پیوں

جب حزن کے کانٹے کوئی بوئے تو پیوں
دل شدتِ جذبات سے روئے تو پیوں
میں جس کے لئے نیند سے توڑوں رشتہ
تسلیم وہی چین سے سوئے تو پیوں

سن کر مری روداد وہ رودے تو پیوں
اشکوں سے مرے دوش بھگودے تو پیوں
ناگاہ کسی روز مرے زخموں کو
تسلیم وہ تیزاب سے دھودے تو پیوں

انگور کی ترشی سے جو ہوتی آگاہ
کوشش کبھی چھونے کی نہ کرتی روباہ
بے سود لٹا مال و زرِ عز و جاہ
لا حول و لا قوت الا باللہ

مت لومری سوکھی ہوئی چھاگل کی آہ
سمٹو نہ اس انداز سے اے چشمہ و چاہ
رکھتا ہے کوئی اتنا بھی دامن کوتاہ
لا حول و لا قوت الا باللہ

آمادۂ الطاف ہے ساقی کی نگاہ
برسائے ہے وہ دیکھو شراب ابرِ سیاہ
ایسے میں بھی زاہد نہیں مائل بہ گناہ
لا حول و لا قوت الا باللہ

رکھتے ہو مئے خلدِ بریں پیشِ نگاہ
کرتے ہو نصیحت تو مگر خوب ارے واہ
حوروں کی ہوس اور بتوں سے اکراہ
لا حول و لا قوت الا باللہ

پسپا ہوئی پھر صبر و تحمل کی سپاہ
پھر جھوم کے مشرق سے اٹھا ابرِ سیاہ
یاد آئی مجھے پھر تری مے ریز نگاہ
لاحول ولا قوت الا باللہ

اللہ ستایا نہ کرو شام و پگاہ
مت آؤ، پہ وعدہ نہ کرو خواہ مخواہ
کب تک رہے اسطرح کوئی چشم براہ
لاحول ولا قوت الا باللہ

پردیس میں ترچھی رہے ساجن کی کلاہ
یاں روتی رہوں میں ہی کرتی رہوں آہ
ندیوں میں پلی اوس پہ کرتی ہوں نباہ
لاحول ولا قوت الا باللہ

پہنے گی نہیں عید کا جوڑا واللہ
ساجن کے بہانے سے ہے گوری آگاہ
پارس کی تو بس لو ہے پہ رہتی ہے نگاہ
لاحول ولا قوت الا باللہ

ساجن ہی خبر چاند کی لائے تو ہو عید
گوری کو وہی گلے لگائے تو ہو عید
چوکھٹ تک آ گیا جھرو کے کا غم
پردیسی غم گسار آئے تو ہو عید

آنگن کے پیالوں میں چھلکتی ہے عید
پردیس میں آوارہ بھٹکتی ہے عید
تسلیم میاں، ہجر کے ماروں کے لئے
نمرود کی آگ سی بھڑکتی ہے عید

بارش میں مرے ساتھ ہی ساون بھی جلے
بے باک گھٹاؤں کا دامن بھی جلے
جس آگ میں جل کر میں ہوئی ہوں جوگن
اس بار اسی آگ میں ساجن بھی جلے

آنکھیں بھی جلیں، لب بھی جلیں، دل بھی جلے
حاصل بھی جلے تیرا محاصل بھی جلے
ہر رات مری جان جلانے والے
مجھ شمع کے ہمراہ تو محفل بھی جلے

سورج مکھی ہمسائے کے آنگن میں سکھی
اور ناگ پھنی میرے دامن میں سکھی
سب وقت کے آنچل سے نو چیں ہوئی
میں بال تلا شا کروں درپن میں سکھی

ویسے سبھی کچھ ٹھیک ہے آنگن میں سکھی
بجلی تو لپکتی ہے مرے من میں سکھی
ساجن کہ گئے چھوڑ کے تنہا مجھکو
دن رات برستے ہوئے ساون میں سکھی

جوہی نہ رہی، اب میں چمیلی نہ رہی
رانی تھی کبھی دل کی اکیلی نہ رہی
ایسا ہے تو پھر اے مرے نرموہی سجن
اب کہدے کہ میں تیری سہیلی نہ رہی

سپنوں کی ہوادار حویلی نہ رہی
اک نیند تھی سو وہ بھی سہیلی نہ رہی
جا تو بھی اے پردیس میں رہنے والے
کہدے کہ میں ساون میں اکیلی نہ رہی

میں اس کو سکھی کر کے رقم کیا بھیجوں
احوالِ دل و دیدۂ نم کیا بھیجوں
رقصاں سے وہ خود درد کے انگاروں پر
"کشمیر" کو میں اپنا "اسم" کیا بھیجوں

میں بھیج تو دوں، لیکن دھت کیا بھیجوں
ہر بات اسے پرت پرت کیا بھیجوں
اچھا ہے مرے حال سے واقف نہیں وہ
برسات کو ٹوٹی ہوئی چھت کیا بھیجوں

آنگن کے گھنے نیم کا سایہ بھیجوں
یا گاؤں کے چوپال کا قصہ بھیجوں
جس سے اسے پردیس میں گھر یاد آجائے
ساجن کو اب ایسا میں بھلا کیا بھیجوں

شعلوں کی قبا خار کا بستر بھیجوں
یا دل پہ جو چلتا ہے وہ خنجر بھیجوں
بے درد ترے ہوش ٹھکانے لگ جائیں
حال اپنا لفافے میں جو بھر کر بھیجوں

پہلے اسے تسلیم و دعا بھیجوں گی
پھر حالِ غمِ صبح ومسا بھیجوں گی
اس بار اسے شہر کے ہنگامے میں
جو دل میں مرے ہے وہ خلا بھیجوں گی

ہر حال مین ساجن کو بُلا بھیجوں گی
شکل ہے مگر میں بخدا بھیجوں گی
وہ پیش کرے ابکے نہ آنے کا جواز
رستے میں ہو دریا تو عصا بھیجوں گی

نے رنگ، نہ رشحہ، نہ مہک بھیجی ہے
پھر زخموں کو سوغاتِ نمک بھیجی ہے
ابکے بھی سکھی حسبِ روایت اس نے
بس جھوٹی تسلی کی کمک بھیجی ہے

سوکھے ہوئے لب، پیاسی نظر بھیجی ہے
ایک اک خبرِ قلب و جگر بھیجی ہے
اس بار تو میں نے اسے قاصد کے ہاتھ
آنے کے لئے راہگزر بھیجی ہے

بنئے کے کھاتوں سے موٹے آنسو
تسلیم، مگر بھاگ کے چھوٹے آنسو
بہتے ہوئے سونے کا کوئی مول نہیں
رخسار کے بازار میں کھوٹے آنسو

تنہائیوں کے داغ تو دھوتے آنسو
ہمدردیوں کے بیج تو بوتے آنسو
سینے میں ہی مخفی ہے غموں کا سیلاب
اے کاش کہ آنکھوں میں بھی ہوتے آنسو

چھونا جسے مشکل اسے چکھتی ہوگی
سینے میں کئی زخم وہ رکھتی ہوگی
ہر شب مرے لوٹ آنے کی امید لئے
درپن میں وہ اپنے کو پرکھتی ہوگی

''جاں دیکھے ہی شاید مری مکتی ہوگی!''
یہ سوچ کے وہ کنوئیں پہ جھکتی ہوگی
اس کو تو کوئی روک نہ پاتا ہوگا
مجھ پر ہی ترس کھا کے وہ رکتی ہوگی

اندر ہی اندر وہ گھلتی ہوگی
اظہار کی کھڑکی نہیں کھلتی ہوگی
تسلیم مرے ہجر میں تنہا ہی وہ
احساس کی میزان میں تلتی ہوگی

احسان کسی کا بھی نہ لیتی ہوگی
پتوار کسی کو بھی نہ دیتی ہوگی
تنہائی کے پر موج سمندر میں بھی
کشتی کو اکیلے ہی وہ کھیتی ہوگی

آنکھوں سے الگ نیند کی مستی ہوگی
ہر پل وہ اجڑ اجڑ کے بستی ہوگی
جاں سوز سیہ رات کی تنہائی میں
ندیا مری شبنم کو ترستی ہوگی

حالات کی بھٹی میں تپتی ہوگی
مالا وہ مرے نام کی جپتی ہوگی
دن رات برستے مہِ نیساں میں بھی
سیپی مری بے آب تڑپتی ہوگی

موقوف ہوا آج سے جن پر جانا
ان چشموں کو چٹان سے ڈھک کر جانا
جاتے ہو تو لوٹ آنے کی تاریخ تلک
اوراق کلنڈر کے الٹ کر جانا

تشکیک کی دیوار گرا کر جانا
آؤ گے بہت جلد بتا کر جانا
آنسو سے مقدر بھی بدل جاتا ہے
تم رونے والوں کو جگا جانا

بہرے کی ہتھیلی پہ چمک کر گرنا
اندھے کے پیالے میں کھنک کر گرنا
گرنا مگر اس امر کو رکھنا ملحوظ
کہلائے شہادت ترا تھک کر گرنا

انجانے میں ہی کھل گئے لب پوچھ لیا
کہکر نہیں آنے کا سبب پوچھ لیا
اس بات کی ظالم نے سزا یوں دی مجھے
پل بھر میں مرا نام و نسب پوچھ لیا

قطعہ

ایسی نیرنگیٔ حیات کہاں
حیثیت شاہ کی مزاج ملنگ
متوازن ہے آپ ہی کے یہاں
وضعِ مشرق میں سطوتِ افرنگ
آپ کا باغ ہے بہار بدست
نثر کی بو ہے اور شعر کا رنگ
کھل رہی ہے فضائے شعر و ادب
اُڑ رہی ہے جناب ہی کی پتنگ
آج تو چار دانگ عالم بھی
دیکھ کر آپ کا عروج ہے دنگ
شعر موزوں تو سبھی کرتے ہیں
آپ سا کون ہے بلند آہنگ
فکر سے رشکِ بانؔی و مانؔی
اور اظہار غیرتِ ارژنگ

نابغہ بھی جو سامنے ہو کبھی
آپ کی علمیت سے آئے تنگ
قیصر روم کیا عزیزِ مصر
زیب دیتا ہے آپ کو اورنگ
آپ ہی کی طرف رمیدہ ہیں
عرض کا آہو، التجا کا پلنگ
چاہیئے اِک یونہی سا کمپیوٹر
تاکہ ہم جیت لیں پروف کی جنگ
تاکہ تسلیمؔ جی بجاتے رہیں
آپ کے نام کا رباب و چنگ

تمام شد